تاریخ تدوین و جمع قرآن

مؤلف

ڈاکٹر اسماعیل احمد الطحان

مترجم

محمد رضی الاسلام ندوی

اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی

تاریخ تدوین وجمع قرآن

مؤلف

ڈاکٹر اسماعیل احمد الطحان

مترجم

محمد رضی الاسلام ندوی

اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ!

کتاب: تاریخ تدوین وجمع قرآن

مؤلف: ڈاکٹر انعام الحسن احمد الطحان

مترجم: محمد رضی الاسلام ندوی

ناشر: اسلامک ریسرچ اکیڈمی۔ کراچی
(ادارہ معارف اسلامی۔ کراچی)

تقسیم کنندہ: اکیڈمی بک سینٹر (A.B.C.)
ڈی۔۳۵، بلاک۔۵، فیڈرل بی ایریا
کراچی۔۷۵۹۵۰
فون: ۳۶۳۴۹۸۴۰۔۳۶۸۰۹۲۰۱(۰۲۱)

اشاعت: ذوالحج ۱۴۳۲ھ ۔ نومبر ۲۰۱۱ء

قیمت: ..... روپے

فہرست مضامین

عرضِ مترجم	۵
مسلمانوں کا قابلِ فخر سرمایہ	۷
جمع وتدوین قرآن کے اسلامی مصادر کی خامی	۸
مسلمانوں کی سہل انگاری اور مستشرقین کے شبہات	۸
تدوین قرآن سے متعلق صحیح روایات	۹
تدوین قرآن سے متعلق کم زور روایات	۱۰
مستشرقین کے شبہات	۱۱
کیا عہدِ نبویؐ میں قرآن صرف سخت چیزوں پر لکھا جاتا تھا؟	۱۲
جمع قرآن سے متعلق روایات	۱۷
ان روایات کا اضطراب واختلاف	۱۹
مستشرقین کے شبہات	۲۲
اس قضیہ کو حضرت ابوبکرؓ کے دور کا مانا جائے یا حضرت عثمانؓ کے دور کا؟	۲۳
متفق علیہ روایات اسے حضرت ابوبکرؓ کے دور کا واقعہ قرار دیتی ہیں	۲۳
حضرت عثمانؓ کا کام	۲۵
کیا حضرت ابوبکرؓ نے قرآن کا ذاتی نسخہ تیار کروایا تھا؟	۲۷
حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی مخالفت کی حقیقت	۲۸
قرأتوں سے متعلق مستشرقین کے شبہات	۲۹

'سبعۃ اُحرف' پر تحقیقی بحث ۳۵
کیا 'سبعۃ اُحرف' سے مراد سات وجوہِ اختلاف ہیں؟ ۳۵
کیا ان سے مراد عرب کی سات زبانیں ہیں؟ ۳۸
'سبعۃ اُحرف' کا صحیح مفہوم ۴۱
اختلاف لہجات کے معاملے میں زیادہ توسّع مناسب نہیں ۴۵
قرآن اور قرأتِ قرآن دو الگ الگ چیزیں ہیں ۴۷
مصحف عثمانی میں مختلف قرأتوں کی حقیقت ۴۹

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرضِ مترجم

قرآن کریم پر مستشرقین (Oricntalists) نے جو اعتراضات کیے ہیں، ان میں سے ایک بڑا اعتراض اس کے جمع و تدوین کے بارے میں ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ عہدِ نبوی میں قرآن تحریری صورت میں بہ شکل کتاب مرتب نہیں تھا۔ اس کی ترتیب و تدوین بعد میں خلیفۂ اوّل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ یا خلیفہ سوم حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے دور میں ہوئی۔ اس طرح وہ یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ ممکن ہے لوگوں کے حافظہ پر اعتماد کرنے کے نتیجے میں اس کا کچھ حصہ ضبطِ تحریر میں آنے سے رہ گیا ہو اور وہ موجودہ قرآن میں شامل نہ ہو سکا ہو۔ اسی طرح یہ حضرات اختلافِ قرأت کے مسئلہ کو غلط طریقے سے پیش کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک اللہ کے رسول ﷺ نے قرآن کو مختلف قرأتوں میں پڑھنے کی اجازت دی تھی۔ حضرت عثمانؓ نے اپنے حدود و اختیارات سے آگے بڑھ کر لوگوں کو صرف ایک قرأت پر پڑھنے کا پابند بنا دیا اور دیگر قرأتوں پر مبنی مصاحف کو ضائع کروا دیا۔ اس طرح لوگ اختلافاتِ قرأت سے حاصل ہونے والے فوائد سے محروم ہو گئے۔

علمائے اسلام نے ان اعتراضات کا بھرپور جواب دیا ہے اور اشکالات کو رفع کرنے کی کوشش کی ہے۔ علوم القرآن کے موضوع پر تمام کتابوں میں اس سلسلے میں قیمتی مباحث موجود ہیں۔ اردو زبان میں اس موضوع پر مستقل کتابیں بھی دستیاب ہیں۔ ان میں مولانا عبداللطیف رحمانیؒ کی تاریخ القرآن، نواب صدیق حسن خاںؒ کی جمع و تدوین قرآن اور مولانا مناظر احسن گیلانی کی تدوین قرآن خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔

زیرِ نظر کتابچہ بھی اس موضوع پر مفید معلومات فراہم کرتا ہے۔ فاضل مصنف کا یہ شکوہ بجا ہے کہ قرآن کریم کے بارے میں یہ اعتراضات پیدا ہونے کے کسی حد تک قصوروار ہم

مسلمان بھی ہیں، اس لیے کہ مستشرقین نے اپنے اعتراضات کے لیے خام مواد ہمارے یہاں ہی سے حاصل کیا ہے۔ جمع و تدوین قرآن سے متعلق صحیح روایات کے پہلو بہ پہلو بہت سی ضعیف اور بے بنیاد روایتیں بھی قدیم کتابوں میں موجود ہیں۔ ضرورت ہے کہ اس موضوع کی تمام روایات کا بے لاگ جائزہ لیا جائے اور تنقیح کر کے صحیح صورتِ حال واضح کی جائے۔

فاضل مصنف نے اپنے اس کتابچہ میں یہ خدمت انجام دی ہے۔ انہوں نے واضح کیا ہے کہ پورا قرآن عہدِ نبویؐ میں تحریری شکل میں موجود تھا۔ انہوں نے تدوینِ قرآن کے سلسلے میں حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عثمانؓ کے کاموں کی نوعیت واضح کی ہے اور اختلافِ قرأت کے موضوع پر بھی مفصل و مدلل بحث کی ہے۔ اس موضوع کی اہمیت کے پیشِ نظر راقم سطور نے اس کا ترجمہ کیا، جو سہ ماہی تحقیقات اسلامی علی گڑھ میں دو قسطوں (جولائی۔ ستمبر، اکتوبر۔ دسمبر ۲۰۰۳ء) میں شائع ہوا۔ افادۂ عام کے لیے اب اسے کتابچہ کی صورت میں شائع کیا جا رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ مصنف، مترجم اور ناشر کو اس کے اجر سے نوازے اور اس کا فائدہ عام کرے۔ انہ سمیع قریب مجیب۔

ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی علی گڑھ — محمد رضی الاسلام ندوی

۱۲ر رمضان المبارک ۱۴۲۹ھ/ ۱۳ر ستمبر ۲۰۰۸ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مسلمانوں کا قابلِ فخر سرمایہ

مسلمانوں کے لیے قرآنِ کریم کی تدوین وجمع کی تاریخ سے بڑھ کر کوئی قابلِ فخر سرمایہ نہیں ہے۔ وہ نزول کے اوّل دن سے اصحابِ رسول کی نگاہوں کے سامنے تھا۔ انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ تیئس سال کے عرصے میں قرآن کس طرح نبی ﷺ پر نازل ہوتا رہا ہے۔ اس کے بارے میں کوئی بات ان سے پوشیدہ نہ تھی۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ قسم کھا کر کہتے ہیں کہ کتاب اللہ کی ایک آیت بھی ایسی نہیں جس کے بارے میں انہیں معلوم نہ ہو کہ وہ کس کے بارے میں اور کہاں نازل ہوئی ہے؟ حضرت عکرمہ سے کسی نے قرآن کی ایک آیت کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے کوہ سلع کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ''یہ آیت اس پہاڑ کے دامن میں نازل ہوئی تھی[1]۔''

صحابۂ کرام نے قرآنِ کریم کی حفاظت میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ انہوں نے نبی ﷺ سے سن کر اسے سینوں میں بھی محفوظ کیا اور نوشتوں کی شکل میں بھی مدون کیا، یہاں تک کہ ان کی یہ کاوشیں تاریخ کا جزو بن گئیں، مگر صحابہؓ کی نسل ختم ہوتے ہوتے حالات دگرگوں ہو گئے۔ مختلف فتنوں نے سر اٹھایا۔ حقائق غبار آلود ہو گئے اور جوں جوں زمانہ گزرتا گیا ان پر خواہشاتِ نفس کی گمراہیوں اور راویوں کے اوہام کی تہیں جمتی گئیں۔ اس طرح کچھ عرصہ کے بعد تحقیق کرنے والے کے لیے ناممکن ہو گیا کہ وہ رطب و یابس روایات کے انبار میں سے حقائق کا استنباط کر سکے۔ اس وقت جن لوگوں نے اس تاریخ کو از سرِ نو رقم کرنے کی کوشش کی، انہوں نے بس یہ کیا کہ پوری امانت داری کے ساتھ ایسی تمام روایات نقل کر دیں اور

---

[1] (موازنہ کے لیے ملاحظہ کیجیے: مباحث فی علوم القرآن، ڈاکٹر صبحی صالح، ص ۱۳۲)

اس کی کچھ پروا نہیں کی کہ ان میں سے بعض روایتیں باہم متناقض ہیں یا ان میں عقل و منطق سے بعید تر باتیں موجود ہیں۔ متن اور سند کے نقد کا، اگرچہ شرعی و قانونی مباحث میں اہتمام ملتا ہے، لیکن تاریخ جمع و تدوین قرآن کو بیان کرنے میں اس کا کوئی واضح اثر دکھائی نہیں دیتا۔ مسلمانوں کی اس سہل انگاری سے دشمنانِ اسلام کو موقع مل گیا، چنانچہ مستشرقین نے اپنے مخصوص استشراقی طریقۂ کار (جو ظن و تخمین، قیاسات اور اوہام پر مبنی ہوتا ہے) سے کام لے کر قرآن کے بارے میں شبہات پیدا کیے اور اس طرح اس دین کی بنیادوں کو متزلزل کرنے کی کوشش کی۔

جمع و تدوین قرآن کے اسلامی مصادر کی خامی

تاریخ جمع و تدوین قران کے موضوع پر جو کتابیں پائی جاتی ہیں، خواہ وہ قدماء کی ہوں یا جدید مصنفین کی، جو شخص ان کا مطالعہ کرے گا اور جائزہ لے گا وہ دیکھے گا کہ ان میں بڑی حد تک یکسانیت اور مشابہت پائی جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سب نے ایک طرح کے مصادر سے معلومات حاصل کی ہیں اور روایات پر نقد و تبصرہ کی کسی خاص جدوجہد کے بغیر انہیں جوں کا جوں نقل کر لیا ہے۔ اگر کسی نے کچھ کوشش بھی کی تو بہت سرسری، جس سے حقائق نکھر کر سامنے نہیں آ پاتے، ورنہ اکثر وہ خود بحث و تحقیق کی زحمت گوارا نہیں کرتے اور بس ان مصادر کا حوالہ دے دینے پر اکتفا کرتے ہیں۔

مسلمانوں کی سہل انگاری اور مستشرقین کے شبہات

مسلمانوں کے شایانِ شان یہ تھا کہ وہ جمع و تدوین قرآن کی تاریخ کی اہمیت محسوس کرتے، اس لیے کہ یہ محض ایک کتاب کی تاریخ نہیں، بلکہ ایک دین کی تاریخ کا معاملہ ہے اور محض ایک دین کی تاریخ نہیں بلکہ ایک تہذیب کی تاریخ اس سے وابستہ ہے۔ ایک ایسی تہذیب جس نے انسانیت کو ماضی میں بھی صحیح راہ دکھائی ہے اور اس کا حال اور مستقبل بھی اس سے سنور سکتا ہے، لیکن انہوں نے جس طرح سہل انگاری سے کام لیا، اس موضوع پر

رطب و یابس روایات جمع کر دیں اور ان کی چھان پھٹک کی زحمت گوارا نہیں کی۔ اس کی بنیاد پر مستشرقین کو قرآن کے بارے میں شبہات پیدا کرنے کا پورا موقع مل گیا اور انہوں نے اس موقع کو ہاتھ سے جانے نہ دیا۔

یہ صحیح ہے کہ علمائے اسلام نے ان شبہات کا علمی جائزہ لینے اور ان کے رد کرنے کی قابلِ قدر خدمات انجام دی ہیں، لیکن ان شبہات کے پیدا ہونے کی ذمہ داری ان لوگوں پر بھی عائد ہوتی ہے جنہوں نے اس تاریخ کو غلط طریقے سے پیش کیا۔

آئندہ سطور میں چند ایسی روایات پیش کی جائیں گی جو قرآن کے بارے میں بعض شبہات اور اعتراضات کا باعث بنیں۔ اس سے واضح ہوگا کہ قرآن کی جمع و تدوین کی تاریخ لکھتے وقت ضرورت تھی کہ ایسی روایات سے اعراض کیا جاتا اور ان کے بجائے ایسی روایات پر اعتماد کیا جاتا جو ان سے زیادہ مستند تھیں اور ان سے حقیقت نکھر کر سامنے آتی۔

تدوین قرآن سے متعلق صحیح روایات

صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ نبی ﷺ کو قرآن کریم زبانی یاد تھا۔ آپ اسے دہراتے رہتے تھے اور آپ نے نصِ قرآنی کو لکھوا بھی لیا تھا۔ کتابتِ وحی کے لیے آپ نے بعض صحابہ کو متعین کر رکھا تھا۔ روایات میں ان کی تعداد تینتالیس آئی ہے۔ روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مکہ میں آنحضرت ﷺ کے حکم پر وحی کی کتابت کرنے والے عبداللہ بن ابی سرح تھے۔ کاتبینِ وحی میں خلفاء اربعہ، حضرت زبیر بن العوامؓ، حضرت خالد بن سعیدؓ اور حضرت ابان بن سعیدؓ وغیرہ کا بھی نام آتا ہے۔ نبی ﷺ کے لیے کتابت وحی کی خدمت سب سے زیادہ حضرت زید بن ثابتؓ نے انجام دی[۲]۔ امام بخاریؒ نے حضرت براءؓ سے روایت کی ہے کہ جب آیت لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ وَالْمُجٰهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ (النساء:۹۵) ''اہلِ ایمان میں سے وہ لوگ جو گھر بیٹھے رہتے ہیں اور جو اللہ کی راہ میں جان و مال سے جہاد کرتے ہیں، دونوں کی

---

۲ ملاحظہ کیجیے: تاریخ القرآن، ابوعبداللہ الزنجانی، ص ۴۲

حیثیت یکساں نہیں ہے'' نازل ہوئی تو نبی ﷺ نے فرمایا: ''زید کو بلاؤ، وہ لوح اور دوات (یا فرمایا شانہ کی ہڈی اور دوات) لے کر آئیں۔'' وہ حاضر ہوئے تو فرمایا، لکھو: لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ ۔۔۔ اس وقت نبی ﷺ کی پشت پر حضرت ابن اُم مکتومؓ موجود تھے جو نابینا تھے۔ انہوں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول ﷺ! میرے لیے کیا حکم ہے؟ میں تو نابینا ہوں۔ اسی وقت غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ ''ان لوگوں کے علاوہ جو کسی معذوری کی وجہ سے بیٹھے رہیں'' کا اضافہ نازل ہوا[3]۔

کتبِ حدیث میں ایسی بہت سی احادیث ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول ﷺ کاتبینِ وحی کو قرآن املا کراتے تھے تو ساتھ ہی یہ بھی بتاتے تھے کہ آیات کو کس ترتیب سے لکھیں اور کون سی آیت کس صورت میں کس جگہ رکھیں۔ جامع ترمذی میں حضرت عثمانؓ سے مروی ہے کہ بسا اوقات رسول اللہ ﷺ پر کئی کئی سورتیں نازل ہوتی رہتی تھیں۔ جب قرآن کا کچھ حصہ نازل ہوتا تو آپ کسی کاتبِ وحی کو بلاتے اور فرماتے: ''ان آیات کو لکھ کر فلاں سورت میں شامل کر دو۔'' کبھی ایک آیت نازل ہوتی تو آپ فرماتے: ''اس آیت کو فلاں سورت میں فلاں جگہ رکھ دو[4]۔''

تدوینِ قرآن سے متعلق کم زور روایات

اچانک یہ حقائق بعض کم زور روایات کی دھندلاہٹ میں گم ہو جاتے ہیں۔ مثلاً سیوطی نے اپنی کتاب الاتقان میں امام زہری کی سند سے عبید نامی ایک راوی سے یہ روایت کی ہے کہ حضرت زید بن ثابتؓ نے فرمایا: ''رسول اللہ ﷺ کی وفات ہوگئی، اس وقت تک قرآن کسی چیز میں جمع نہیں کیا گیا تھا۔''

اگر اس روایت کو صحیح مان لیا جائے تو بھی اس سے تحریری طور پر موجود مختلف چیزوں کو جمع کرنا مراد لیا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ امام خطابیؒ فرماتے ہیں: ''یعنی اس وقت تک قرآن کو نزولِ

---

[3] صحیح بخاری، ۵/۱۸۳، کتاب التفسیر، سورہ نساء، باب لا یستوی القاعدون من المؤمنین ..... الآیۃ

[4] جامع ترمذی، ۱۱/۲۲۵، ابواب التفسیر، سورۃ التوبۃ، حدیث نمبر ۱۔

وحی مکمل ہونے کے انتظار میں ایک مصحف کی شکل میں جمع نہیں کیا گیا تھا۔ جب نبی ﷺ کی وفات کے ساتھ نزولِ وحی کی تکمیل ہوگئی تو اللہ تعالیٰ نے آپ کے خلفائے راشدین کو اس کام کا الہام کیا، تاکہ اس نے حفاظتِ قرآن کا جو وعدہ کیا تھا وہ پورا ہو۔[۵]"

ویسے اس روایت کی سند پر کلام کیا گیا ہے۔ اس میں ایک راوی ابراہیم بن بشار معتبر نہیں ہے۔ اس سے بہت سی منکر روایتیں مروی ہیں۔ دوسرا راوی عبید جس سے زہری نے روایت کی ہے، کون ہے؟ اس کا علم رجال اور طبقات کی کتابوں سے نہیں ہوتا۔[۶]

مستشرقین کے شبہات

اس کے باوجود یہ روایت مستشرقین کی نظر میں راجح ہے، اس لیے کہ یہ اُس روایت سے مطابقت رکھتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جنگِ یمامہ میں جب بہت سے حفاظِ قرآن شہید ہوگئے تو حضرت عمرؓ اور حضرت ابوبکرؓ کو قرآن کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہوگیا تھا۔ اگر قرآن تحریری شکل میں اور یکجا موجود ہوتا تو ان حضرات کے خوف کی کوئی وجہ نہیں تھی۔[۷]

اس نقطۂ نظر کی تائید کرنے والی متعدد کم زور روایتیں موجود ہیں۔ مثال کے طور پر ابنِ ابی داؤد نے ابنِ شہاب کی سند سے روایت کیا ہے، وہ فرماتے ہیں: "ہمیں معلوم ہوا ہے کہ بہت سا قرآن نازل ہوا تھا، لیکن جنگِ یمامہ میں بہت سے حفاظ جنہیں پورا قرآن یاد تھا، شہید ہوگئے۔ اس بنا پر قرآن کا خاصا حصہ ضائع ہوگیا اور اسے ضبطِ تحریر میں نہ لایا جاسکا۔[۸]

ایسی ہی روایات کا سہارا لے کر مستشرقین زور دے کر یہ بات کہتے ہیں کہ نبی ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں قران کی تدوین نہیں ہوسکتی تھی۔ 'بلاشیر' (Blachere) نے لکھا ہے: "قرآن نے ڈرایا ہے کہ وہ دن دور نہیں جب یہ دنیا فنا ہوجائے گی اور قیامت برپا ہوگی۔ اسی طرح قرآن نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ نبیؐ اپنی آنکھوں سے کافروں کا انجام دیکھ لیں گے۔ اس بنا پر نبی کی زندگی میں وحی کو مدون کرنے کا کوئی محرک موجود نہیں تھا، اس لیے کہ یہ عقیدہ پایا جاتا تھا کہ

---

۵ الاتقان فی علوم القرآن، سیوطی، ۱/ ۵۷

۶ دراسات فی القرآن، ڈاکٹر سید خلیل، ص ۸۸

۷ آرتھر جفری، کتاب المصاحف

۸ المصاحف، ص ۲۳

قیامت سے قبل نبی کو موت نہیں آئے گی یا یہ عقیدہ تھا کہ قیامت بہت جلد آنے والی ہے[9]۔''

اس نقطۂ نظر کے پس پردہ مستشرقین کا اصل مقصد کیا تھا؟ یہ بات پوشیدہ نہ تھی۔ ان کا مقصد نصِ قرآنی میں شک وشبہ پیدا کر دینا تھا، اس لیے کہ اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ حیاتِ نبوی میں قرآن مدون نہیں ہوا تھا تو لامحالہ یہ ماننا پڑے گا کہ مسلمانوں نے قرآن کی حفاظت حافظہ کے ذریعہ کی اور کسی کا حافظہ خواہ کتنا ہی قوی ہو، طویل عرصے تک وہ تمام باتوں کو محفوظ نہیں رکھ سکتا۔ اس طرح قرآن کی حیثیت شاعری کے مثل ہو جائے گی جسے عربوں نے حافظہ کے ذریعہ محفوظ رکھا، لیکن اس کا بہت سا حصہ ضائع ہو گیا اور اس میں تبدیلی واقع ہو گئی[10]۔

واقعہ یہ ہے کہ قرآن کریم اگرچہ نبی ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں تحریری شکل میں موجود تھا، لیکن اس کے باوجود حضراتِ شیخین ابوبکرؓ وعمرؓ کے اندیشہ کی وجہ یہ تھی کہ جس طرح وہ لوگوں کے سینوں میں سورتوں اور آیتوں کی ترتیب کے ساتھ محفوظ تھا اس طرح ایک مصحف کی شکل میں مرتب نہیں تھا۔ صحابۂ کرام اس تحریری سرمایہ کے معتبر ہونے کے گواہ تھے، اس لیے انہیں اندیشہ ہوا کہ اگر اسی طرح دیگر جنگوں میں بھی حفاظ صحابہ شہید ہو گئے تو حافظہ اور تحریری مواد دونوں کی روشنی میں قرآن کے جمع وترتیب کا کام دشوار ہو جائے گا[11]۔

کیا عہدِ نبوی ﷺ میں قرآن صرف سخت چیزوں پر لکھا جاتا تھا؟

مستشرقین نے اپنے نقطۂ نظر کی تائید کے لیے بعض دیگر ایسی روایات کا سہارا لیا ہے جو صراحتاً یا کنایتاً ان شکوک وشبہات کو تقویت دیتی ہیں۔ مثلاً وہ روایات جو علمائے اسلام کی کتابوں میں عام ہیں کہ عہدِ نبوی میں کتابتِ وحی کے لیے استعمال ہونے والی چیزیں سخت مادّوں کے قبیل سے تھیں، مثلاً پتھر کی سلیں، ہڈیاں اور کھجور کی ٹہنیاں وغیرہ، ان چیزوں کا

---

[9] القرآن، بلاشیر، عربی ترجمہ رضا سعادۃ، ص ۲۹۔۳۰

[10] ملاحظہ کیجیے: اثر القرآن فی الدراسات اللغویہ، ڈاکٹر عبدالعال سالم، ص ۴

[11] ملاحظہ کیجیے: ہماری کتاب من قضایا القرآن، ص ۶۶۔

تذکرہ حضرت زید بن ثابتؓ سے مروی مختلف روایات میں آیا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے اپنے عہدِ خلافت میں جب انہیں جمع قرآن کا کام سونپا تو انہوں نے کیا کیا؟ وہ خود بیان کرتے ہیں: ''میں کاغذ کے ٹکڑوں، کھجوروں کی ٹہنیوں، سفید پتھر کی باریک سلوں اور لوگوں کے سینوں سے قرآن نقل کرنے لگا۔''

دوسری روایت میں ہے: ''میں کاغذ کے ٹکڑوں، کھجور کی ٹہنیوں، سفید پتھر کی باریک سلوں اور لوگوں کے سینوں سے قرآن جمع کرنے لگا۔''

تیسری روایت کے الفاظ یہ ہیں: ''میں لوگوں کے سینوں، کاغذ کے ٹکڑوں اور پسلی کی ہڈیوں سے قرآن تلاش کرنے لگا۔''

چوتھی روایت یوں ہے: ''میں نے شانہ کی ہڈیوں، کجاوہ کی لکڑیوں، کھجور کی ٹہنیوں اور لوگوں کے سینوں سے قرآن جمع کیا۔''

پانچویں روایت کے مطابق حضرت زید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''میں کاغذ، شانہ کی ہڈیوں، کجاوہ کی لکڑیوں، کھجور کی ٹہنیوں اور لوگوں کے سینوں سے قرآن جمع کرنے لگا[۱۲]۔''

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہ چیزیں تھیں جن پر لکھنا جاننے والے صحابہ اپنے لیے قرآنی آیات لکھ لیا کرتے تھے، لیکن نبی ﷺ کے گھر میں قرآن کس چیز پر لکھا جاتا تھا؟ اس کا علم حضرت زید کی دوسری روایت سے ہوتا ہے:

كنا عند رسول الله ﷺ نؤلف القرآن من الرقاع[۱۳]۔

''ہم رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں 'رقاع' سے قرآن جمع کیا کرتے تھے۔''

رقاع رقعہ کی جمع ہے، اس کا اطلاق چمڑے پر بھی ہوسکتا ہے، پتے پر بھی اور کاغذ پر بھی۔

حضرت براءؓ سے مروی بخاری کی روایت میں لوح و کتف (تختی اور شانہ کی ہڈی) کے الفاظ آئے ہیں۔

یہ روایات مستشرقین کے نزدیک قرآن کے بارے میں شبہات پیدا کرنے کا بہترین

---

۱۲ کتاب المصاحف، ص ۸۔۹، ۲۰

۱۳ جامع ترمذی، ابواب المناقب، مسند احمد، ۵/۱۸۵۔

ذریعہ ثابت ہوئیں۔ انہیں ان لوگوں نے اس حیثیت سے پیش کیا کہ ان میں مذکور چیزوں پر پورا قرآن ضبطِ تحریر میں لانا ممکن نہیں ہے، اس لیے کہ قران کا ایک مکمل نسخہ ایسی جتنی چیزوں پر آئے گا، انہیں رکھنے کے لیے بہت بڑی جگہ چاہیے، جب کہ سیرت میں اس کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا۔ 'بلاشیر' (Blachere) نے لکھا ہے:

''وحی کے اہم حصوں کو ان سخت چیزوں پر لکھنے کا خیال اس وقت آیا جب محمد (ﷺ) نے مدینہ میں سکونت اختیار کی۔ بہرحال قران کی تدوین اس کے آغازِ نزول کے بہت بعد میں ہوئی، اس لیے کہ ابتدا میں اس کے وسائل اور تدوین میں کام آنے والی چیزیں فراہم نہ تھیں[۱۴]۔''

اس طرح بلاشیر نے تدوینِ قرآن کے تصور کو باطل ٹھہرانے کی کوشش کی ہے۔ اس کے مطابق اگر فرض کرلیا جائے کہ عہدِ نبوی میں تدوین کا عمل انجام پایا ہے تو وہ جزوی طور پر صرف مدینہ میں نازل ہونے والی وحی کے اہم حصوں کا ہے اور اس کا بھی امکان ہے کہ تدوین میں استعمال ہونے والی چیزوں کی خرابی کی وجہ سے کچھ حصے مٹ گئے ہوں یا کچھ سے کچھ ہو گئے ہوں۔ اس طرح اس نے وہی نتیجہ نکالنا چاہا ہے جو اس سے پہلے دیگر مستشرقین نکال چکے ہیں کہ قرآن کو حفاظِ صحابہ کی یادداشت کی بنیاد پر ضبطِ تحریر میں لایا گیا اور جمع قرآن سے پہلے بہت سے صحابہ وفات پا چکے تھے۔

حیرت ہے کہ متقدمین اور متاخرین علمائے اسلام نے ان روایات کو نقل کرنے میں اتنا اہتمام کیوں کیا ہے کہ ان سے یہ تاثر قائم ہوتا ہے کہ کتابتِ وحی کے لیے استعمال میں آنے والی بس یہی چیزیں تھیں، حالانکہ حقیقت اس کے برخلاف ہے۔ یہ بات قرینِ عقل نہیں ہے کہ اہلِ عرب پتھر کی سلوں، ہڈیوں اور کھجور کی ٹہنیوں کے علاوہ اور کسی آلۂ تحریر سے واقف ہی نہیں تھے۔ اگر ایسا ہوتا تو مکہ میں نازل ہونے والی آیاتِ قرآنی۔۔۔ جو پورے قرآن کا تقریباً دو تہائی حصہ ہیں۔۔۔ کو ضبطِ تحریر میں لانے کے لیے بڑی مقدار میں ایسی چیزوں کی ضرورت ہوتی اور انہیں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کے لیے اونٹوں کے ایک قافلے

---

[۱۴] القرآن، بلاشیر، ص ۲۹۔

کی ضرورت پڑتی، حالانکہ واقعاتِ سیرت میں ایسا کوئی تذکرہ نہیں ملتا کہ نبی ﷺ کی ہجرتِ مدینہ سے قبل یا آپ کے ساتھ اس تحریری سرمایہ کو اونٹوں کے قافلے پر لاد کر مدینہ پہنچایا گیا ہو[۱۵]۔

حقیقت سے قریب تر بات یہ ہے کہ اہلِ عرب آلاتِ تحریر میں سے ملائم اور باریک چیزوں مثلاً چمڑے اور کاغذ وغیرہ سے واقف تھے، خاص طور پر ایسے حالات میں، جبکہ ہم جانتے ہیں کہ مکہ میں تجارتی ماحول پایا جاتا تھا اور تجارتی معاملات کو ضبطِ تحریر میں لایا جاتا اور حسابات لکھے جاتے تھے۔

سیرتِ نبوی کا یہ واقعہ مشہور ہے کہ قریش نے بنو ہاشم کا سماجی بائیکاٹ کرنے کے لیے ایک دستاویز تحریر کی تھی، پھر کچھ عرصے کے بعد جب ان میں سے چند لوگوں نے ظلم پر مبنی اس دستاویز کو چاک کر دینا چاہا تو پتا چلا کہ پوری دستاویز کو دیمک نے کھا لیا ہے۔ صرف باسمک اللّٰھم کے الفاظ باقی بچے ہیں۔ یہ قطعی دلیل ہے اس بات کی کہ وہ دستاویز کسی ملائم اور باریک چیز پر لکھی ہوئی تھی۔ مدینہ میں اس طرح کی اور بھی بہت سی تحریروں کا ثبوت ملتا ہے۔ مثلاً صلح حدیبیہ کی دستاویز، بادشاہوں اور حکمرانوں کو اسلام کی طرف دعوت دینے کے لیے رسول اللہ ﷺ کے مکاتیب، نبی ﷺ کے گھر میں محفوظ قرآنی تحریریں جنہیں اکٹھا کر کے حضرت زیدؓ نے قرآن مدون کیا اور صحابہ کے تیار کردہ بعض ذاتی صحیفے جن میں انہوں نے قرآن لکھ رکھا تھا اور جنہیں حضرت عثمانؓ نے قرآن کے مستند نسخے کی بہت سی نقلیں تیار کروانے کے بعد جلانے کا حکم دے دیا تھا۔

مسلمانوں کا آلاتِ تحریر میں سے ان ملائم اور باریک چیزوں سے واقف ہونا قرینِ قیاس ہے، اس لیے کہ ان کے گرد اہلِ کتاب کے بڑے بڑے قبیلے رہتے تھے۔ ان کے پاس ان کی مذہبی کتابیں تھیں جو ان کے مطالعے میں رہتی تھیں۔ قرآن نے بارہا ان کتابوں کی طرف اشارہ کیا ہے اور عربوں سے خطاب کرتے ہوئے ان ملائم اور باریک آلاتِ تحریر مثلاً صحف (صحیفوں) اور قراطیس (کاغذ کے ٹکڑوں) کا تذکرہ کیا ہے:

---

۱۵ موازنہ کے لیے دیکھیے، عن القرآن، محمد صبیح، ص ۸۶۔

اِنَّ هٰذَا لَفِی الصُّحُفِ الْاُوْلٰیo صُحُفِ اِبْرٰهِیْمَ وَ مُوْسٰیo (الاعلیٰ:۱۸۔۱۹)

''یہی بات پہلے آئے ہوئے صحیفوں میں بھی کہی گئی تھی۔ ابراہیمؑ اور موسیٰؑ کے صحیفوں میں۔''

وَ لَوْ نَزَّلْنَا عَلَیْکَ کِتٰبًا فِیْ قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوْهُ بِاَیْدِیْهِمْ لَقَالَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِیْنٌo (الانعام:۷)

''اے پیغمبر! اگر ہم تمہارے اوپر کوئی کاغذ میں لکھی لکھائی کتاب بھی اتار دیتے اور لوگ اسے اپنے ہاتھوں سے چھو کر بھی دیکھ لیتے تب بھی جنہوں نے حق کا انکار کیا ہے، وہ یہی کہتے کہ یہ تو صریح جادو ہے۔''

قُلْ مَنْ اَنْزَلَ الْکِتٰبَ الَّذِیْ جَآءَ بِهٖ مُوْسٰی نُوْرًا وَّ هُدًی لِّلنَّاسِ تَجْعَلُوْنَهٗ قَرَاطِیْسَ تُبْدُوْنَهَا وَتُخْفُوْنَ کَثِیْرًا... (الانعام:۹۱)

''ان سے پوچھو، پھر وہ کتاب جسے موسیٰؑ لایا تھا، جو تمام انسانوں کے لیے روشنی اور ہدایت تھی، جسے تم پارہ پارہ کر کے رکھتے ہو، کچھ دکھاتے ہو اور بہت کچھ چھپا جاتے ہو۔۔۔ آخر اس کا نازل کرنے والا کون تھا؟''

مذکورہ بالا تفصیل سے یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ ہم کتابتِ وحی میں ان سخت آلاتِ تحریر (پتھر کی سلوں، ہڈیوں اور ٹہنیوں) کے استعمال میں آنے کی نفی کر رہے ہیں۔ ہم صرف اس بات کے منکر ہیں کہ کتابتِ وحی کے لیے کام آنے والی بس یہی چیزیں تھیں یا انہی چیزوں کو زیادہ تر استعمال کیا گیا۔ ہمارا کہنا یہ ہے کہ ان چیزوں کو ناگزیر ضرورت پر ہی استعمال کیا گیا، مثلاً کبھی ملائم و باریک آلاتِ تحریر کم پڑ گئے یا نزولِ وحی کے وقت فوری طور پر وہ دستیاب نہیں ہوئے تو عارضی طور پر قرآن کو ان سخت آلاتِ تحریر پر لکھ لیا گیا اور بعد میں اسے رقعات (چمڑے اور کاغذ وغیرہ) پر نقل کر لیا گیا، جیسا کہ حضرت زیدؓ کی روایت میں اشارہ ملتا ہے[۱۶]۔

---

[۱۶] موازنہ کے لیے ملاحظہ کیجیے: القرآن المجید، محمد عزۃ دروزہ، ص ۷۷۔۷۹

جمع قرآن سے متعلق روایات

حضرت ابوبکرؓ کے عہدِ خلافت میں جمع قرآن کا جو کام انجام پایا، اس سے متعلق بعض روایات ایسی ملتی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت زیدؓ کو قرآن کی بعض آیات ابتدا میں نہیں مل رہی تھیں، تلاشِ بسیار کے بعد مل سکیں۔

مثلاً ایک روایت میں وہ فرماتے ہیں: ''میں قرآنی آیات تلاش کر کر کے انہیں ترتیب سے نقل کرنے لگا۔ مجھے ایک آیت نہیں ملی جسے میں نبی ﷺ کو پڑھتے ہوئے سنا کرتا تھا: لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ... (التوبۃ:۱۲۸) میں نے اسے تلاش کیا تو وہ مجھے خزیمہ بن ثابت انصاریؓ کے پاس ملی، چنانچہ میں نے اسے سورۂ توبہ میں اس کی متعین جگہ لکھ لیا۔''

دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں: ''میں قرآن جمع کرنے لگا، مجھے سورۂ توبہ کی آخری آیتیں خزیمہ بن ثابتؓ کے پاس ملیں۔''

تیسری روایت میں حضرت زیدؓ فرماتے ہیں: ''ابوبکرؓ نے مجھے بلا کر قرآن جمع کرنے کا حکم دیا۔ میں قرآنی آیات تلاش کر کے انہیں ترتیب سے لکھنے لگا۔ ایک آیت جسے میں رسول اللہ ﷺ سے سنا کرتا تھا، مجھے کسی کے پاس نہیں ملی۔ میں نے تلاش کیا تو ایک انصاری صحابی کے پاس ملی۔ وہ آیت ہے: مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ (الاحزاب:۲۳) چنانچہ میں نے اس کی متعین جگہ اسے شامل کر لیا۔''

چوتھی روایت زہری سے مروی ہے، وہ خارجہ بن زید سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت زید بن ثابتؓ نے فرمایا: ''سورۂ احزاب کی ایک آیت، جسے میں رسول اللہ ﷺ کو پڑھتے ہوئے سنا کرتا تھا، نہیں مل رہی تھی۔ تلاش کیا تو وہ خزیمہ بن ثابتؓ یا ابوخزیمہؓ کے پاس ملی۔ میں نے اس کی متعین جگہ اسے شامل کر لیا۔ حضرت خزیمہؓ ذوالشہادتین کے لقب سے جانے جاتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کی گواہی کو دو آدمیوں کی گواہی کے برابر قرار دیا تھا۔''

پانچویں روایت میں یحییٰ بن عبادؒ اپنے والد عباد بن عبداللہ بن زبیر سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت حارث بن خزیمہ[۱۷] سورۂ توبہ کی آخری دو آیتیں لے کر حضرت عمر بن الخطاب

---

[۱۷] ایک روایت میں یہ نام حارث بن خزمہ ہے، ملاحظہ کیجیے: لطائف الاشارات، قسطلانی، ص ۶۵

رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرت عمرؓ نے دریافت کیا، تمہارے ساتھ اور کوئی گواہ ہے کہ یہ قرآن کی آیتیں ہیں؟ انہوں نے جواب دیا: مجھے معلوم نہیں، اللہ کی قسم میں گواہی دیتا ہوں کہ میں نے انہیں رسول اللہ ﷺ کی زبانِ مبارک سے سنا ہے، انہیں یاد کیا ہے اور محفوظ رکھا ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا: دوسرا گواہ میں ہوں۔ پھر فرمایا: اگر یہ تین آیات ہوتیں تو انہیں ایک علیحدہ سورت بنا دیتا۔ جاؤ دیکھو، قرآن کی کسی سورت میں، جہاں مناسب ہو، شامل کر دو۔ میں نے انہیں سورۂ برأت (توبہ) کے آخر میں شامل کر دیا۔

چھٹی روایت ابوالعالیہ کے واسطے سے حضرت ابی بن کعبؓ سے مروی ہے، فرماتے ہیں:

''جب لوگ سورۂ توبہ کی اس آیت پر پہنچے ثُمَّ انْصَرَفُوْا صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ (التوبۃ: ۱۲۷) تو سمجھے کہ سورت ختم ہوگئی۔ میں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے اس کے بعد دو آیتیں اور پڑھائی ہیں: لَقَدْ جَآءَكُمْ... یہ اس سورت کا آخری حصہ ہے۔''

ساتویں روایت ابن وہب سے مروی ہے کہ حضرت خزیمہ بن ثابتؓ آئے اور کہنے لگے: ''میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ لوگوں نے دو آیتیں چھوڑ دی ہیں، انہیں شامل نہیں کیا ہے۔'' حضرت عثمانؓ نے دریافت کیا: ''وہ کون سی آیتیں ہیں؟'' انہوں نے فرمایا: لَقَدْ جَآءَكُمْ... حضرت عثمانؓ نے فرمایا: ''میں بھی گواہی دیتا ہوں کہ یہ دونوں آیتیں وحی کا حصہ ہیں، انہیں کہاں رکھ دیا جائے؟'' حضرت خزیمہؓ نے فرمایا: ''قرآن کی جو آیتیں سب سے آخر میں نازل ہوئی ہیں، ان کے آخر میں ان دونوں آیتوں کو شامل کر دیا جائے۔'' چنانچہ انہیں سورۂ برأت (توبہ) کے آخر میں شامل کر دیا گیا۔

مذکورہ بالا روایات کو ابن ابی داؤد نے کتاب المصاحف میں نقل کیا ہے[18] لیکن امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے اور انہی سے امام قسطلانیؒ نے اپنی کتاب لطائف الاشارات میں نقل کیا ہے کہ حضرت زیدؓ نے فرمایا:

''سورۂ توبہ کی آخری آیتیں مجھے صرف ابوخزیمہ انصاریؓ کے پاس ملیں، ان کے علاوہ اور کسی کے پاس نہیں ملیں''[19]۔

۱۸؎ ملاحظہ کیجیے، کتاب المصاحف، ص ۷۔۳۱ ۱۹؎ دیکھیے، لطائف الاشارات، قسطلانی، ص ۳۵

علامہ زرکشیؒ نے اپنی کتاب 'البرہان' میں حضرت زیدؓ کا یہ قول نقل کیا ہے:

''سورۂ توبہ کی آخری آیتیں مجھے ابوخزیمہ انصاریؓ کے پاس ملیں، جن کی گواہی کو رسول اللہ ﷺ نے دو آدمیوں کی گواہی کے برابر قرار دیا تھا''[20]۔

امام بخاریؒ نے کتاب فضائل القرآن، باب جمع القرآن میں بیان کیا ہے کہ حضرت زید کو حضرت خزیمہ بن ثابتؓ کے پاس سورۂ احزاب کی آیت مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ... ملی تھی۔

ان روایات کا اضطراب واختلاف

مذکورہ بالا روایات کا اضطراب واختلاف واضح ہے۔ ابتدا میں نہ ملنے والی آیت کون سی تھی؟ سورۂ توبہ کی آخری آیتیں یا سورۂ احزاب کی آیت یا دونوں؟

جس صحابی کے پاس وہ ملی تھیں اُن کا نام کیا تھا؟ خزینہ بن ثابت انصاری یا ابوخزیمہ انصاری یا حارث بن خزیمہ یا ابن خزمہ؟ اور یہ کس عہد کا واقعہ ہے؟ عہد ابوبکر کا یا عہد عثمان کا؟

اس موضوع کا مطالعہ کرنے والا حیران رہ جاتا ہے کہ اس واقعہ کی حقیقت کیا ہے؟ اس کی حیرت اس وقت اور بڑھ جاتی ہے جب ان روایات پر متقدمین علمائے اسلام کی تعلیقات اور تبصرے اس کی نظر سے گزرتے ہیں، مثلاً

قسطلانی نے اپنی کتاب ارشاد الساری[21] میں حضرت زید کا یہ قول نقل کیا ہے:

''میں نے سورۂ توبہ کی آخری آیتیں خزیمہ انصاری کے پاس پائیں۔'' یہ خزیمہ بن ثابت بن الفاکہ الخطمی ہیں جن کا لقب ذوالشہادتین تھا''۔

پھر قسطلانی ابن شہاب زہری کے واسطے سے حضرت زیدؓ کا یہ قول نقل کرتے ہیں:

''مجھے سورۂ توبہ کی آخری دو آیتیں ابوخزیمہ انصاریؓ کے پاس ملیں۔'' ان کا نسب یہ ہے: ابن اوس بن اصرم بن ثعلبہ بن غنم بن مالک بن النجار۔

---

[20] دیکھیے، البرہان فی علوم القرآن، زرکشی، ۱/۲۳۴

[21] ملاحظہ کیجیے: ارشاد الساری لشرح صحیح البخاری، شہاب الدین قسطلانی، ۷/۱۶۳

ایک دوسری روایت حضرت زیدؓ سے یہ مروی ہے:

''جب ہم حضرت عثمانؓ کے حکم سے حضرت حفصہؓ کے پاس محفوظ صحیفے سے نقلیں تیار کر رہے تھے تو سورۂ احزاب کی ایک آیت مجھے نہیں ملی، جب کہ اسے میں رسول اللہ ﷺ کو پڑھتے ہوئے سنا کرتا تھا۔ تلاش کرنے پر وہ صرف خزیمہ بن ثابت انصاریؓ کے پاس ملی جن کی گواہی کو رسول اللہ ﷺ نے دو آدمیوں کی گواہی کے برابر قرار دیا تھا، چنانچہ میں نے اسے اس کی متعین جگہ شامل کر دیا۔'' یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اسے صرف ایک شخص کی گواہی پر قرآن میں شامل کیا گیا، اس لیے کہ اس کا وحی میں سے ہونا صحابہ کے نزدیک بہ تواتر ثابت تھا۔ حضرت عمرؓ نے گواہی دی تھی کہ میں نے اسے رسول اللہ ﷺ کی زبانِ مبارک سے سنا ہے۔ ایسی ہی گواہی حضرت ابی بن کعبؓ اور حضرت بلال بن امیہؓ نے بھی دی تھی۔

عمدۃ القاری میں ابن شہابؒ سے روایت ہے کہ حضرت زیدؓ نے فرمایا:

''سورۂ توبہ کی آخری آیتیں مجھے ابوخزیمہ انصاریؓ کے پاس ملیں۔''

ابوالفرج کہتے ہیں: ''ابوخزیمہ وہم ہے، صحیح نام خزیمہ ہے''[۲۲]۔

اسی کتاب میں یہ بیان بھی موجود ہے: ''سورۂ توبہ کی آخری آیتیں کس کے پاس ملی تھیں، اس سلسلے میں اصحاب ابراہیم بن سعد کے درمیان اختلاف ہے۔ بعض لوگ ان کا نام ابوخزیمہ اور بعض خزیمہ بتاتے ہیں۔ موسیٰ بن اسماعیل کہتے ہیں: سورۂ توبہ کی آیتیں ابوخزیمہ کے پاس اور سورۂ احزاب کی آیت خزیمہ کے پاس ملی تھی۔''

اسی کتاب میں زہری سے ایک دوسری روایت بھی ہے۔ وہ خارجہ بن زید کے واسطے سے حضرت زیدؓ بن ثابت سے روایت کرتے ہیں کہ ''جب ہم نے حضرت عثمانؓ کے حکم سے قرآن کے نسخے نقل کیے تو اس وقت سورۂ احزاب کی ایک آیت نہیں مل رہی تھی۔ تلاش کرنے پر وہ خزیمہ انصاری کے پاس ملی جن کی گواہی کو رسول اللہ ﷺ نے دو مردوں کی گواہی کے برابر قرار دیا تھا''۔

مؤلف عمدۃ القاری اس روایت کو نقل کرنے کے بعد کہتے ہیں: ''اگر اس پر یہ کہا جائے

---

۲۲ دیکھیے: عمدۃ القاری شرح صحیح البخاری، عینی، ۱۸/۲۸۲

کہ حضرت خزیمہؓ کے پاس ملنے والی آیت تو سورۂ توبہ کی تھی، جب کہ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پاس سورۂ احزاب کی آیت ملی تھی، تو اس کا جواب یہ دیا جائے گا کہ یہ روایت حصر پر دلیل نہیں ہے۔ ممکن ہے دونوں سورتوں کی آیتیں صرف انہی کے پاس ملی ہوں''[۲۳]۔

مذکورہ بالا تعلیقات اور تبصروں سے ممکن ہے حقیقت کے بعض پہلو نکھر گئے ہوں، لیکن اس میں شک نہیں کہ اس خلط مبحث سے عہدِ ابوبکر صدیق میں جمع قرآن کے عمل پر سلبی اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ اسی وجہ سے بعض محققین نے لکھا ہے کہ ''ایسی روایات جن سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کی بعض آیتیں دورانِ تدوین نہیں مل رہی تھیں، تلاش کرنے پر کسی صحابی کے پاس ملیں، معتبر نہیں ہیں یا جمع قرآن کا جو طریقہ متقدمین کی متداول کتابوں سے معلوم ہوتا ہے، وہ حقیقت سے بعید تر ہے[۲۴]۔

---

۲۳ عمدۃ القاری، ۱۹/۱۱۶

۲۴ عن القرآن، محمد صبیح، ص ۲۱۷۔

مستشرقین کے شبہات

ایسے محققین کے نزدیک، مذکورہ روایات میں شک کرنے کی وجہ غالباً یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جمع قرآن کا واقعہ مسلمانوں کے نزدیک انتہائی اہمیت رکھتا ہے، اس لیے اس کے بارے میں اس قدر ابہام اور اضطراب کا تصور نہیں کیا جا سکتا کہ یہ بات ہی متعین نہ ہو سکے کہ نہ ملنے والی آیات کون سی تھیں؟ تلاش کرنے پر وہ کس صحابی کے پاس ملیں اور یہ کس دور کا واقعہ ہے؟

جمعِ قرآن کے مسئلے پر ان باتوں سے زیادہ اہم، قابل توجہ اور خطرناک بات یہ ہے کہ یہ واقعہ حضرت عثمانؓ کے عہد میں قرآن کے نسخوں کی تیاری کے دوران پیش آیا ہو، جیسا کہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے، اس لیے کہ اس سے عہدِ ابوبکرؓ میں جمع قرآن کی تاریخ کے بہت سے ثابت شدہ حقائق کی بنیادیں ڈھہ جاتی ہیں اور مستشرقین کے ان شبہات کو تقویت ملتی ہے کہ ''فتنۂ ارتداد کے دوران جب بہت سے حفاظِ قرآن صحابہ شہید ہو گئے تو حضرت ابوبکرؓ کو قرآن کے سلسلے میں فکر دامن گیر ہوئی۔ وہ قرآن کا ایک ایسا نسخہ تیار کرنے کے بارے میں سوچنے لگے جو مختلف صحابہ کے تیار کردہ ذاتی نسخوں کا جامع ہو، لیکن وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکے اور ایسا نہیں لگتا کہ وہ اپنے اقتدار اور نفوذ کی بدولت دیگر صحابہ کے نسخوں سے بہتر نسخہ تیار کر سکے ہوں۔ بیس سال کے بعد اس سلسلے میں ایک اہم اقدام کیا گیا اور صحابہ نے تیسرے خلیفہ حضرت عثمان بن عفانؓ کے عہد میں قرآن کا ایک ایسا نسخہ تیار کرنے کا ارادہ کیا جو زیادہ جامع اور محیط ہو۔ اس وقت حضرت ابوبکرؓ کے تیار کردہ نسخے کو بنیاد بنایا گیا اور اس میں قرآن کے بعض ان حصوں کو بھی شامل کیا گیا جو اس وقت تک منتشر تھے یا بعض صحابہ کو زبانی یاد تھے''[۲۵]۔

---

۲۵ القرآن، بلاشیر، ص ۳۰۔۳۱

اس قضیہ کو حضرت ابوبکرؓ کے دور کا مانا جائے یا حضرت عثمانؓ کے دور کا؟

جمعِ قرآن کے اس قضیہ میں ہمیں دو باتوں میں سے کسی ایک قبول کرنا ہوگا، یا تو ہم یہ تسلیم کرلیں کہ جمع قرآن کے دوران بعض آیات کے نہ ملنے اور تلاش کرنے پر کسی ایک صحابی کے پاس ملنے کا واقعہ اس دور کا ہے جب حضرت عثمانؓ کے عہدِ خلافت میں قرآن کے نسخے تیار کیے جارہے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ حضرت ابوبکرؓ کے عہدِ خلافت میں جمع قرآن کا عمل صحیح طریقے پر نہیں انجام پایا تھا اور بعض آیات اس میں شامل ہونے سے رہ گئی تھیں۔ قرآن کے مکمل اور اس کے متن کے معتبر ہونے کی بات خیالی ہے، جسے مسلمان مؤرخین نے عہد بہ عہد تسلیم شدہ حقیقت کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ اسی طرح اس سے یہ بھی نتیجہ نکلے گا کہ حضرت عثمانؓ کے عہد میں قرآن کو از سرِ نو جمع کیا گیا اور مصحف ابوبکر میں جو آیات شامل ہونے سے رہ گئی تھیں، انہیں شامل کیا گیا۔ بالفاظ دیگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے حضرت عثمانؓ کے عہد تک متنِ قرآن نقص و اضطراب کا شکار رہا، اس بنا پر اس کی صحت کا اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔

یا ہمارے لیے لازم ہے کہ ان تمام روایات کو قطعی رد کردیں جو اس واقعہ کو عہد عثمانؓ کا قرار دیتی ہیں، اس لیے کہ ان میں اضطراب پایا جاتا ہے اور وہ ان روایات سے مختلف ہیں جن پر تقریباً اجماع کی حد تک اتفاق ہے اور جن سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں انتہائی دقت، ضبط اور مہارت کے ساتھ جمع قرآن کا عمل انجام دیا گیا تھا اور اس کا ایک مکمل نسخہ تیار ہوگیا تھا۔ بعد میں حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت میں ان کا کام بس یہ تھا کہ انہوں نے عہد ابوبکرؓ میں تیار کردہ متفق علیہ مصحف کے بہت سے نسخے تیار کروا کر مختلف شہروں میں بھیج دیے۔

متفق علیہ روایات اسے حضرت ابوبکرؓ کے دور کا واقعہ قرار دیتی ہیں

ان متفق علیہ روایات کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے جمع قرآن کے لیے ان

تحریروں کو بنیاد بنایا جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں محفوظ تھیں اور جن صحابہ کو قرآن یاد تھا یا اس کے کچھ حصے ان کے پاس تحریری صورت میں موجود تھے، ان سے وہ تحریریں منگائیں، تاکہ اس منتشر تحریری مواد کا موازنہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں محفوظ قرآن کو یکجا تحریروں سے کرلیا جائے اور تمام لوگ جمع قرآن کے اس عمل میں شریک رہیں اور کسی کے دل میں کچھ شک وشبہ نہ رہے، اسی لیے انہوں نے یہ کام بہت سے صحابہ کی موجودگی میں کرایا اور لازم کیا کہ اگر کوئی شخص ایسی آیت پیش کرے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں محفوظ تحریر سے مختلف ہو یا اس میں موجود نہ ہو تو اس پر حافظ یا کتابت کی دو گواہیاں پیش کرے[۲۶]۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لوگوں میں اس چیز کا اعلان کردیا۔ ان کے پاس قرآن کے جو اجزا تحریری شکل میں موجود تھے وہ لے کر آئے اور ان کا قرآن کے اس نسخے سے موازنہ کیا گیا جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں محفوظ تھا۔ اس سلسلے میں یہ چیز بعید نہیں ہے کہ قرآن کی بعض آیتیں جو تمام صحابہ کو یاد تھیں، وہ تحریری صورت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں نہ ملی ہوں (اِدھر اُدھر ہوگئی ہوں) اور بعض صحابہ کے پاس تحریری شکل میں موجود ہوں، اس لیے یہ چیز موجب حیرت نہیں ہے کہ حضرت زید کو سورۂ توبہ کی آخری آیتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں تحریری طور پر نہ ملی ہوں اور انہوں نے صحابہ سے دریافت کیا ہو کہ کیا کسی کے پاس وہ تحریری طور پر موجود ہیں۔ یہ چیز یوں بھی قرینِ قیاس ہے کہ یہ دونوں آیتیں مکہ میں نازل ہوئی تھیں، لیکن ترتیب قرآن میں ان کی جگہ مدینہ میں نازل ہونے والی سورت کے آخری میں تھی، وہ سورت جس کی تکمیل ۹ ہجری میں ہوئی تھی۔ ممکن ہے سورۂ احزاب کی آیت بھی کسی وجہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں تحریری شکل میں نہ ملی ہو۔

یہ شرط عائد کی گئی تھی کہ اگر کوئی صحابی ایسی آیت پیش کرے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں تحریری شکل میں موجود نہ ہو یا وہاں محفوظ تحریر سے مختلف ہو تو وہ دو گواہیاں پیش کرے۔ یہ دونوں گواہیاں کس نوعیت کی مطلوب تھیں؟ زبانی یادداشت کی یا تحریر کی؟ یا ایک زبانی یادداشت کی اور ایک تحریر کی؟ اس سلسلے میں علماء کا اختلاف ہے۔ بہرحال تحریر کی دو

---

۲۶ ملاحظہ کیجیے: البرہان ۱/ ۲۳۸ اور موازنہ کے لیے دیکھیے ہماری کتاب من قضایا القرآن، ص ۶۷

گواہیوں کے قائلین کے لیے ضروری تھا کہ وہ کسی ایسے شخص کو تلاش کرتے جو اس شرط کو پورا کر سکے۔ حضرت خزیمہ بن ثابتؓ ذوالشہادتین سے بہتر نام انہیں نہیں مل سکتا تھا جس کی طرف اس واقعہ کو منسوب کر دینے میں بھی کوئی حرج نہیں تھا، اس لیے کہ وہ تحریر کے ایک گواہ تھے اور ان کے ساتھ زبانی یادداشت کے بہت سے گواہ موجود تھے۔

اس قضیہ میں جو اضطراب پایا جاتا ہے وہ اسی نوعیت کا ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ ذوالشہادتین کی صفت بعض روایات میں حضرت ابوخزیمہ کی جانب منسوب کر دی گئی ہے[۲۷]۔ اگر یہ بات نہیں ہے تو کیسا عجیب اتفاق ہے کہ ایک ہی واقعہ سے دو ایسے افراد کا تعلق ہے جن میں سے ایک کا نام ابوخزیمہ اور دوسرے کا نام خزیمہ ہے۔ دونوں کے درمیان کنیت کے علاوہ اور کوئی فرق نہیں، یہاں تک کہ تیسرا آدمی بھی (اگرچہ وہ روایت ضعیف ہے) خزیمی ہے اور اس کا نام حارث بن خزیمہ ہے۔ بہرحال جس صحابی کے پاس آیت ملی تھی ان کا نام خزیمہ ہو یا ابوخزیمہ اور ملنے والی آیات سورۂ توبہ کی ہو یا سورۂ احزاب کی، یا دونوں ہوں، جمع قرآن کی نوعیت اور طریقۂ کار کو دیکھتے ہوئے یہ واقعہ حضرت ابوبکرؓ کے عہد کا معلوم ہوتا ہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا کام

رہا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا کام تو وہ..... جیسا کہ ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں..... اس کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا کہ انہوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں تیار شدہ متفق علیہ مصحف کی بہت سی نقلیں تیار کروا دیں، تاکہ وہ متفق علیہ مصحف لوگوں کے درمیان عام ہو جائے۔ ان کے زمانے میں قرآن کے معاملے میں لوگوں کے درمیان اختلافات ہونے لگے تھے۔ بعض لوگ کچھ کمی بیشی کرنے لگے تھے یا ایک لفظ کی جگہ دوسرا لفظ استعمال کرنے لگے تھے۔ قرآن کے متداول نسخوں میں قرآن کے اصل الفاظ اور ان کی تشریح و تاویل ایک دوسرے میں خلط ملط ہونے لگے تھے۔ بعض لوگوں نے غیر قرآن کو غلطی سے قرآن سمجھ لیا

---

۲۷ دیکھیے: البرہان ۱/۲۳۴

تھا۔ اس وقت ضرورت تھی کہ قرآن کے متفق علیہ نسخہ کو عام کیا جائے، تاکہ لوگوں کے اختلافات اور ان کی غلط فہمیاں دور ہوں۔ قرآن، غیر قرآن سے ممتاز ہو جائے اور لوگوں کو نص قرآن کا یقینی علم حاصل ہو جائے۔ اگر کوئی عبارت قرآن کے متفق علیہ نسخہ کے نص سے مختلف ہو تو قطعی طور پر اس کے قرآن نہ ہونے کا فیصلہ کیا جا سکے۔ قرآن کا متفق علیہ نسخہ تیار ہو جانے کے بعد اس کے علاوہ کسی مصحف کے باقی رہنے کا کوئی جواز نہ تھا، اسی لیے حضرت عثمانؓ نے بقیہ تمام نسخوں کو جلائے جانے کا حکم دے دیا، تاکہ آئندہ تمام اختلافات کا خاتمہ ہو جائے اور قرآن ہر طرح کے التباس سے محفوظ ہو جائے [۲۸]۔

حضرت عثمانؓ کے کام میں کوئی نئی چیز نہیں تھی، سوائے اس کے کہ انہوں نے مصاحف کو بغیر نقطوں کے تیار کروایا، تاکہ اگر کسی لفظ کی متعدد قرأتیں ہوں، مثلاً 'تتلو' اور 'تبلو' تو ان کے لے ایک ہی رسم الخط اختیار کیا جا سکے۔ بعض مواقع پر ایسا ممکن نہ ہو سکا تھا، مختلف قرأتیں ایک رسم الخط کے تحت نہ آ سکیں تو بعض مصاحف میں ایک قرأت لکھی گئی اور بعض دیگر مصاحف میں دوسری قرأت، مثلاً سورۂ توبہ کی آیت نمبر ۱۰۰ مصحف مکی میں تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ (مِنْ کے ساتھ) اور مصحف کوفی میں جو آج کل متداول ہے تَجْرِیْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ (بغیر مِنْ) کے الفاظ کے ساتھ لکھی گئی [۲۹]۔

اسی طرح حضرت عثمانؓ نے قرآن قریش کے رسم الخط میں لکھوایا۔ انہوں نے قرآن کے نسخے تیار کرنے والی جماعت میں شامل تینوں قریشی صحابہ (حضرت عبداللہ بن زبیرؓ، حضرت سعید بن العاصؓ اور حضرت عبدالرحمٰن بن حارث بن ہشامؓ) سے فرمایا کہ "جب قرآن کے کسی لفظ کے رسم الخط کے سلسلے میں تمہارے اور زیدؓ کے درمیان اختلاف ہو تو اسے قریش کے طریقے پر لکھو، اس لیے کہ قرآن انہی کی زبان میں نازل ہوا ہے"۔ چنانچہ ان صحابہ نے ایسا ہی کیا، اسی لیے لفظ التابوت (البقرۃ: ۲۴۸، طٰہٰ: ۳۹) کو لمبی ت سے لکھا گیا، جبکہ مدینہ میں وہ گول ۃ سے (التابوۃ) لکھا جاتا تھا [۳۰]۔

---

۲۸ اس موضوع پر تفصیل کے لیے دیکھیے ہماری کتاب من قضایا القرآن، ص ۷۷۔۷۹۔

۲۹ کتاب المصاحف، ص ۴۷۔ ۳۰ کتاب المصاحف، ص ۱۹۔

بہ کثرت روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عثمانؓ نے اُمّ المؤمنین حضرت حفصہؓ سے قرآن کا وہ نسخہ منگوایا جو حضرت ابوبکرؓ کے عہد خلافت میں تیار ہوا تھا اور جو ان کے باپ حضرت عمرؓ بن الخطاب کی وفات کے وقت سے ان کے پاس محفوظ تھا اور حضرت زید بن ثابتؓ اور تینوں قریشی صحابہ کو حکم دیا کہ اس کے متعدد نسخے تیار کریں۔ اس کے برخلاف ایک روایات سے اشارہ ملتا ہے کہ حضرت عثمانؓ نے پہلے خود ایک مصحف جمع کروایا، پھر حضرت حفصہؓ کے پاس موجود مصحف سے اس کا موازنہ کروایا۔ یہ خبر واحد قابل التفات نہیں ہے، اس لیے کہ یہ بات عقل و منطق سے بعید تر ہے کہ حضرت عثمانؓ از سر نو وہ کام کروائیں جو ان سے پہلے ابوبکرؓ کے عہد میں ہو چکا تھا اور وہ بھی اس صورتِ حال میں کہ ان کے تیار کردہ نسخہ پر اتنے صحابہ کا اجماع نہیں ہوسکتا تھا جتنے صحابہ کا اجماع مصحف ابوبکرؓ پر ہوا تھا، اس لیے کہ ان کے عہد تک بہت سے صحابہ شہید ہو چکے تھے۔

شاید اس روایت کی بنیاد ایک دوسری روایت پر ہے جو اس سے بھی زیادہ کم زور ہے۔ اس کے مطابق جب حضرت عثمانؓ نے اُمّ المؤمنین حضرت حفصہؓ سے مصحف مانگا تو انہوں نے اسے دینے سے انکار کر دیا، پھر اس شرط کے ساتھ دینے پر تیار ہوئیں کہ اسے انہیں واپس کر دیا جائے گا[۳۱]۔

کیا حضرت ابوبکرؓ نے قرآن کا ذاتی نسخہ تیار کروایا تھا؟

مستشرقین نے اس روایات کو اچک لیا اور حضرت حفصہؓ کے مصحف دینے سے انکار کرنے کی وجہ یہ بیان کی کہ انہوں نے اسے اپنے باپ سے ورثہ میں پایا تھا۔ مستشرقین کے خیال میں حضرت ابوبکرؓ نے اپنی زندگی میں جو مصحف تیار کروانے کا آغاز کیا تھا اس کی تکمیل حضرت عمرؓ کے عہد میں ہو پائی تھی، اس لیے کہ جلد ہی حضرت ابوبکر کی وفات ہوگئی تھی۔ اسی لیے انہوں نے طبقاتِ ابن سعد کی اس روایات کو ترجیح دی ہے جس میں حضرت عمرؓ کو پہلا جامع قرآن کہا گیا ہے۔ مستشرقین نے یہ خیال بھی ظاہر کیا ہے کہ حضرت عمرؓ کے مشورے

---

۳۱ ملاحظہ کیجیے: کتاب المصاحف، ص ۹

سے حضرت ابوبکرؓ کے جمع قرآن کا محرک ان کی یہ خواہش تھی کہ ان کے پاس بھی قرآن کا ایک نسخہ ہونا چاہیے، تاکہ سربراہِ جماعت کی پوزیشن بعض ان صحابہ سے کم تر نہ رہے، جس کے پاس قرآن کے ذاتی نسخے موجود تھے، اسی لیے جن صحابہ سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے کتابت وحی کی خدمت لی تھی، ان میں سے ایک کو انہوں نے اس کام پر لگایا کہ ان دونوں کے لیے قرآن کا ایک نسخہ تیار کر دے۔ ابوبکرؓ و عمرؓ کے ذہن میں ایک مصحف تیار کروا کے اسے تمام مسلمانوں کے لیے لازم کرنے کا خیال نہیں تھا[۳۲]۔

اس طرح مستشرقین نے پوری کوشش کی مصحف ابوبکر کو ذاتی رنگ دے دیں، تاکہ وہ تواتر اور قطعیت ثبوت کی صفات سے عاری ہو جائے اور اس میں اور دیگر صحابہ کے تیار کردہ نسخوں میں کوئی فرق باقی نہ رہے اور اس طرح اسے اختیار کرنا لازم نہ رہے[۳۳]۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی مخالفت کی حقیقت

مستشرقین نے دعویٰ کیا ہے کہ حضرت عثمانؓ نے قرآن کے جو نسخے تیار کروائے ان میں مصحف ابوبکرؓ و عمرؓ بھی شامل تھا اور قرآن کے وہ اجزا بھی جو اس وقت تک منتشر حالت میں تھے یا بعض صحابہ کو زبانی یاد تھے اور وہ مصحف ابوبکر میں شامل نہیں ہو سکے تھے۔ حضرت عثمانؓ نے جب اپنے تیار کردہ ان نسخوں کو عام کرنا چاہا تو انہیں مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا، اس لیے کہ جن صحابہ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رہ کر جان و مال کی قربانیاں دیں تھیں، مثلاً حضرت ابن مسعودؓ، انہیں جب معلوم ہوا کہ سرکاری مصحف تیار کرنے کے لیے ان کے نسخوں پر اعتماد نہیں کیا گیا ہے تو انہیں اپنی حق تلفی کا احساس ہوا[۳۴]۔

ان دعوؤں کے پیچھے بعض روایات ہیں جنہیں ابن ابی داؤد نے روایت کیا ہے۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابن مسعودؓ نے حضرت عثمانؓ کے حکم کی مخالفت کی اور کوفہ میں

---

۳۲ دیکھیے، المدخل الی القرآن، بلاشیر ص ۳۳۔۳۶، موازنہ کے لیے دیکھیے بلاشیر کی دوسری کتاب القرآن، ص ۳۰

۳۳ تاریخ القرآن، ڈاکٹر عبدالصبور شاہین، ص ۱۱۰۔

۳۴ القرآن، بلاشیر، ص ۳۴۔۳۵۔

لوگوں کو حکم دیا کہ وہ انہی کے مصحف کو اختیار کریں۔ انہوں نے فرمایا: ''تم لوگ کیوں کر مجھے حکم دیتے ہو کہ میں زید بن ثابت کی قرأت کے مطابق قرآن پڑھوں، جب کہ میں نے ستر سے زائد سورتیں خود رسول اللہ صلی علیہ وسلم سے بہ راہِ راست سن کر یاد کی ہیں، اس وقت زید بن ثابت اتنے نوعمر تھے کہ لڑکوں کے ساتھ آئے تھے، ان کے دو چوٹیاں نکلی رہتی تھیں[۳۵]۔

اگرچہ علماء نے ان روایات کو کم زور قرار دیا ہے، لیکن اگر انہیں تسلیم بھی کرلیا جائے تو ان سے زیادہ سے زیادہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابن مسعودؓ نے اس عمل کی مخالفت یہ گمان کر کے کی کہ اسے نئے سرے سے صرف حضرت زیدؓ نے تنہا انجام دیا ہے، پھر انہیں کیوں کر اس سے الگ رکھا گیا، جب کہ وہ اس کام کے زیادہ مستحق تھے؟ کیوں کہ انہیں قبولِ اسلام میں سبقت حاصل ہے اور انہوں نے ان سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بہ راہِ راست بہت سی سورتیں سنی ہیں، لیکن جب انہیں یقین ہوگیا کہ یہ کوئی نیا کام نہیں ہے، بلکہ مصحف ابوبکرؓ کی نقلیں تیار کی گئی ہیں اور اسے انجام دینے میں حضرت زیدؓ تنہا نہیں ہیں، بلکہ ان کے ساتھ دیگر صحابہ بھی شریک رہے ہیں تو ان کی شکایت دور ہوگئی اور انہوں نے اپنی رضامندی اور موافقت کا اعلان کر دیا[۳۶]۔

مستشرقین کو اس سے کوئی مطلب نہیں ہے کہ حضرت ابن مسعودؓ نے بعد میں اپنی موافقت کا اظہار کر دیا تھا یا مخالفت پر آخر تک قائم رہے تھے۔ انہوں نے تو ان روایات کا سہارا لے کر یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ حضرت عثمانؓ کے کام کی ان کے زمانے میں مخالفت کی گئی ہے اور ان کا کام درست نہیں تھا۔ حضرت عثمانؓ نے دیگر نسخے جلوا دیے تھے۔ اس کو مستشرقین نے ''مقدسات'' کی توہین قرار دیا ہے، کیوں کہ ان نسخوں کو متقی و پرہیز گار لوگوں نے خود حضرت محمد ﷺ کی زندگی میں اور ان سے بہ راہِ راست سن کر تیار کیا تھا[۳۷]۔

قرأتوں سے متعلق مستشرقین کے شبہات

مستشرقین کا دعویٰ ہے کہ حضرت عثمانؓ کے ہاتھوں میں دیگر صحابہ کے تیار کردہ مصاحف

---

۳۵ المصاحف، ص ۱۶۔ ۳۶ المصاحف، ص ۱۸۔ ۳۷ القرآن، بلاشیر، ص ۱۸

تلف ہو جانے کی باوجود نص قرآن میں اختلاف کا مسئلہ ختم نہیں ہوا، اس لیے کہ جو مصاحف کسی وجہ سے بچ رہے ان میں مصحف عثمانی میں مختلف پہلوؤں سے بعض فرق تھے۔ ان سے واضح ہوتا ہے کہ قرآن کے 'سات حروف' (سبعة أحرف) پر نازل ہونے کی وجہ سے محمد (ﷺ) نے اپنے اصحاب کو نصوصِ قرآن پڑھنے میں کتنی آزادی دے رکھی تھی۔ نص قرآن کے حروف کی اہمیت نہیں ہے، بلکہ اصل اہمیت روحِ قرآن کو حاصل ہے، اس لیے ترادفِ محض پر مبنی قرأت میں کوئی حرج نہیں ہے۔

جوں جوں اسلامی معاشرے میں غیر عربی عناصر شامل ہوتے گئے، قرآن کی وجوہِ قرأت میں اضافہ ہوتا گیا، یہاں تک کہ مصحف عثمانی کے نقطوں اور اعراب سے خالی ہونے کی وجہ سے اس کی بنیاد پر ایک گروہ وجود میں آیا۔ اس گروہ کے لوگ آیات کے معانی دیکھ کر الفاظ پر ان کے مناسب نقطوں اور اعراب کے ساتھ قرأت کر لیا کرتے تھے۔

اس طرح مستشرقین نے قران کی 'قرأت بالمعنیٰ' کا نظریہ پیش کیا۔ یقیناً جمع و تدوین قرآن کی تاریخ میں یہ سب سے خطرناک نظریہ ہے، اس لیے کہ یہ نص قرآن کو ہر انسان کی خواہش کے تابع کر دیتا ہے [۳۸]۔

مستشرقین نے قرأتوں کے مسئلے کو اس حیثیت سے پیش کیا گویا وہ محض 'اختیاری' ہیں اور قرآن کے الفاظ اور معانی میں اس حد تک تصرف قابل گرفت نہیں ہے، پھر اس تصور کے ذریعہ انہوں نے مدوّن قرآن کے معانی کی صحت اور اس کے الفاظ کے تحریف اور تبدیلی سے محفوظ ہونے کے سلسلے میں شکوک و شبہات وارد کیے۔

ان دعووں کی تائید میں انہوں نے کچھ روایات پیش کیں جو انہیں اِدھر اُدھر سے مل گئیں، مثلاً حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: قرآن صحیح ہے، جب تک کہ اس کے معانی میں ایسی تبدیلی نہ ہو جائے کہ مغفرت عذاب بن جائے اور عذاب مغفرت'' اور حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ کا ارشاد ہے: ''قرآن کو جس طرح چاہو پڑھو، لیکن ایسا نہ کہ جہاں رحمت کا ذکر ہو وہاں عذاب ہو جائے اور جہاں عذاب کا ذکر ہو وہاں رحمت ہو جائے [۳۹]۔''

۳۸۔ دیکھیے، المدخل الی القرآن، بلاشیر، ص ۶۹۔۷۰ اور مقدمہ المصاحف، آرتھر جفری، ص ۷۔

اسی طرح انہوں نے ابوشامہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ''قرآن پہلے قریش اور ان کے ارد گرد رہنے والے فصیح عربوں کی زبان میں نازل ہوا، پھر دوسرے عربوں کو اجازت دی گئی کہ وہ الفاظ اور اعراب میں اختلاف کے ساتھ اپنی زبانوں میں اس کی قرأت کر سکیں[40]۔

اسی طرح مستشرقین نے اپنے دعاوی کو مضبوط بنانے کے لیے بعض دیگر روایات کا سہارا لیا ہے۔ انہیں ذیل میں نقل کیا جاتا ہے:

اعمش کہتے ہیں: میں نے حضرت انس بن مالکؓ کو سورۂ توبہ کی آیت ۵۷ میں لَوَلَّوْا اِلَيْهِ يَجْمَزُوْن پڑھتے ہوئے سنا۔ انہیں توجہ دلائی گئی کہ قرآن میں لَوَلَّوْا اِلَيْهِ يَجْمَحُوْن ہے۔ انہوں نے جواب دیا: یجمحون، یجمزون اور یشتدون سب یکساں ہیں[41]۔

ایک دوسری روایت میں اعمش کہتے ہیں کہ حضرت انس بن مالکؓ نے سورۂ مزمل کی آیت نمبر ۶ میں وَاَصْوَبُ قِيْلاً پڑھا۔ ان سے کہا گیا: اے ابوحمزہ! قرآن میں تو وَاَقْوَمُ قِيْلاً ہے۔ فرمایا: اقوام، اصوب اور اھیا سب ایک ہی جیسے ہیں[42]۔

ابن وہب کہتے ہیں: امام مالکؒ سے دریافت کیا گیا کہ حضرت عمر بن الخطابؓ نے سورۂ جمعہ کی آیت نمبر ۹ میں فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰه کے بجائے فَامْضَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰه پڑھا تھا۔ کیا آپ کے خیال میں ان کی طرح پڑھنا صحیح ہے؟ انہوں نے جواب دیا: یہ جائز ہے، اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''قرآن 'سات حروف' پر نازل کیا گیا ہے۔ ان میں سے جس پر چاہو پڑھ لو[43]۔''

ابوعبید نے عون بن عبداللہ کی سند سے روایت کیا ہے کہ حضرت ابن مسعودؓ نے ایک شخص کو سورۂ دخان کی آیات نمبر ۴۳، ۴۴ اِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّوْمِ طَعَامُ الْاَثِيْم پڑھائیں۔

---

۳۹ ان روایات کے لیے دیکھیے: مقدمہ تفسیر الطبری، تحقیق احمد محمد شاہر

۴۰ المرشد الوجیز، ابوشامہ، ص ۹۵۔

۴۱ ملاحظہ کیجیے: المحتسب، ابن الجنی، ص ۷۲۔

۴۲ المحتسب، ابن الجنی، ص ۱۶۲۔

۴۳ المرشد، ص ۱۰۵۔

اس نے طَعَامُ الْيَتِيْم پڑھا۔ حضرت ابن مسعودؓ نے کئی مرتبہ دہرایا، لیکن وہ صحیح تلفظ کے ساتھ نہ پڑھ سکا تو انہوں نے فرمایا: طعام الفاجر کہہ سکتے ہو؟ اس نے کہا: ہاں، فرمایا: تو یہی کہہ لو[۴۴]۔

اسی طرح حضرت ابن مسعود سے درج ذیل قرأتیں مروی ہیں:

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ (الفاتحہ:۶) بجائے اَرْشِدْنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْم.[۴۵]

اُدْعُ لَنَا رَبَّكَ (البقرۃ:۶۸) کے بجائے سَلْ لَنَا رَبَّكَ.[۴۶]

فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ (البقرۃ:۴۴) کے بجائے فَوَلُّوا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَهٗ.[۴۷]

وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ (الانفال:۱) کے بجائے فرقت قلوبهم[۴۸]۔

حضرت ابی بن کعبؓ سے درج ذیل قرأتیں منسوب ہیں:

كُلَّمَا اَضَاءَ لَهُمْ مَشَوْا فِيْه (البقرۃ:۲۰) مَرُّوْا فِيْه، مَضَوْا فِيْه.[۴۹]

لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِسَاءِ هِمْ (البقرۃ:۲۲۶) للذين يقسمون من نساء هم.[۵۰]

وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ (الانفال:۲) فزعت قلوبهم.[۵۱]

حضرت ابن عباسؓ سے درج ذیل قرأتیں منسوب کی گئی ہیں:

وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ (البقرۃ:۲۲۷) وَاِنْ عَزَمُوا السَّرَاحَ.[۵۲]

لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ (البقرۃ:۲۰۳) اَنْ يُّكْمِلَ الرَّضَاعَةَ.[۵۳]

حضرت علیؓ کی طرف درج ذیل قرأتیں منسوب ہیں:

فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا (البقرۃ:۱۸۲) مِنْ مُّوْصٍ حَيْفًا.[۵۴]

قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا (یوسف:۳۰) قد شعفها حبا.[۵۵]

---

۴۴ الاتقان، سیوطی، ص ۱/۱۳۵

۴۵ کتاب الشواذ، ابن خالویہ، ص ۲۵

۴۶ البحر المحیط، ابوحیان، ۱/۲۵۱۔

۴۷ البحر المحیط، ابوحیان، ۱/۴۲۹۔

۴۸ البحر المحیط، ابوحیان، ۴/۴۵۷۔

۴۹ البحر المحیط، ابوحیان، ۱/۹۰۔

۵۰ البحر المحیط، ابوحیان، ۲/۱۸۰۔

۵۱ البحر المحیط، ابوحیان، ۴/۴۵۷۔

۵۲ البحر المحیط، ابوحیان، ۲/۱۸۳۔

۵۳ البحر المحیط، ابوحیان، ۲/۲۱۳۔

۵۴ البحر المحیط، ابوحیان، ۲/۲۴۔

۵۵ البحر المحیط، ابوحیان، ۵/۳۰۱۔

مستشرقین کا یہ بھی کہنا ہے کہ جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب کو ایک لفظ کی جگہ اس کے ہم معنی دوسرا لفظ پڑھنے کی اجازت دے دی تھی، اسی طرح انہوں نے اس آزادی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے لیے جائز کرلیا تھا کہ وہ نص میں کچھ اضافہ کرلیں، تاکہ معنی زیادہ واضح ہوجائے یا کم کرلیں تاکہ جو چیز ان کی نگاہ میں صحیح نہیں ہے، اس کی اصلاح ہوجائے۔ اس دعویٰ پر انہوں نے بعض ان روایات سے استدلال کیا ہے جنہیں ابن ابی داؤد نے کتاب المصاحف میں نقل کیا ہے، مثلاً:

اِنَّ الصَّفَا وَ الْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا..... (البقرۃ:۱۵۸)

حضرت ابیؓ کے مصحف اور ان کے قرأت میں اَن لَّایَطَّوَّفَ بِهِمَا ہے[۵۶]۔

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ..... (البقرۃ:۱۹۸)

حضرت ابن مسعودؓ اور حضرت ابن عباسؓ کے مصاحف اور قرأتوں میں اس کے آگے، فی مواسم الحج، کا اضافہ ہے[۵۷]۔

اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّيْطٰنُ يُخَوِّفُ اَوْلِيَآءَهٗ..... (آل عمران:۱۷۵)

حضرت ابن عباسؓ کے مصحف اور قرأتوں میں يُخَوِّفُكُمْ ہے۔ (كُمْ کے اضافہ کے ساتھ)[۵۸]۔

وَ شَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ..... (آل عمران:۱۵۹)

حضرت ابن عباسؓ کے مصحف اور قرأت میں فِيْ بَعْضِ الْاَمْرِ ہے (اضافہ کے ساتھ)[۵۹]۔

فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ..... (النساء:۲۴)

حضرت ابن عباسؓ کے مصحف اور قرأت میں اس کے بعد الی اجل مسمّی کا اضافہ ہے[۶۰]۔

---

۵۶ کتاب المصاحف، ص ۵۳۔
۵۷ کتاب المصاحف، ص ۵۴، ۷۴
۵۸ کتاب المصاحف، ص ۷۴۔
۵۹ کتاب المصاحف، ص ۷۵۔
۶۰ کتاب المصاحف، ص ۸۱۔

فَيُصْبِحُوْا عَلٰى مَآ اَسَرُّوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ نٰدِمِيْنَ○ (المائدۃ:۵۲)

حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے مصحف اور قرأت میں فَيُصْبِحُ الْفُسَّاقُ ہے[۶۱]۔

حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَ الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى..... (البقرۃ:۲۳۸)

حضرت عائشہؓ، حضرت حفصہؓ اور حضرت اُمّ سلمہؓ کے مصاحف اور قرأتوں میں اس کے بعد وَصَلٰوةِ الْعَصْرِ (حرفِ عطف کے ساتھ) اور ایک روایت کے مطابق صَلٰوةِ الْعَصْرِ (بغیر حرف عطف) کا اضافہ ہے۔ اسی روایت کے ساتھ ایک دوسری روایت حضرت ابیؓ یا حضرت زید بن ثابتؓ (شک راوی) کی جانب منسوب ہے کہ الصلوٰۃ الوسطیٰ سے مراد ظہر کی نماز ہے۔ کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ ہم ظہر کے وقت اپنی اونٹنیوں میں اور دیگر کاموں میں سب سے زیادہ مشغول ہوتے ہیں[۶۲]۔

ابن ابی جمرۃ کہتے ہیں کہ حضرت ابن عباسؓ سورۂ بقرہ کی (آیت نمبر ۱۳۷) فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَا اٰمَنْتُمْ بِهٖ یوں پڑھا کرتے تھے: فَاِنْ اٰمَنُوْا بِالَّذِیْ اٰمَنْتُمْ بِهٖ ایک دوسری روایت میں ابن ابی جمرۃ کہتے ہیں: میں نے حضرت ابن عباسؓ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: مثل نہ پڑھو، اس لیے کہ اللہ کا کوئی مثل نہیں ہے۔ یوں پڑھا کرو: فَاِنْ اٰمَنُوْا بِالَّذِیْ اٰمَنْتُمْ بِهٖ.[۶۳]

اسی طرح مستشرقین کے نزدیک اس میں بھی کوئی حرج نہیں ہے کہ قرآن کو اس کے نظم کے خلاف پڑھا جائے یا اس کے الفاظ کی ترتیب الٹ دی جائے، بشرط یہ کہ معنی کوئی فرق نہ آجائے۔ اس دعویٰ پر بھی انہوں نے متعدد روایات سے استدلال کیا ہے، مثلاً:

ابن ابی داؤد روایت کرتے ہیں کہ ابونوفل بن ابی عقرب کہتے ہیں: میں حضرت ابن عباسؓ کو مغرب کی نماز میں سورۂ نصر کی پہلی آیت: اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ کو یوں پڑھتے ہوئے سنا: اِذَا جَاءَ فَتْحُ اللّٰهِ وَالنَّصْرُ.[۶۴]

كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ ..... (مؤمن:۳۵) حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی قرأت میں علی قلب کل متکبر جبار ہے[۶۵]۔

---

۶۱ کتاب المصاحف، ص ۸۲

۶۲ کتاب المصاحف، ص ۸۳۔۸۷

۶۳ کتاب المصاحف، ص ۷۶۔

۶۴ کتاب المصاحف، ص ۸۱

۶۵ کتاب المصاحف، ص ۷۰۔

البرھان میں ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے آیت وَجَآءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ .....
(ق:۱۹) کو یوں پڑھا: وجاءت سكرة الحق بالموت.[۶۶]

اس طرح مستشرقین نے پوری کوشش کی کہ نص قرآن اور اس کی قراءتوں کے محفوظ ہونے میں شبہ پیدا کردیں۔ اگر قرآن نے دعویٰ کیا ہے کہ پہلے کی آسمانی کتابوں میں تحریف ہوگئی ہے تو خود اس میں ہونے والی تحریفات کم نہیں ہیں۔

'سبعۃ اُحرف' پر تحقیقی بحث

یہ کڑوے کسیلے پھل ہمیں اس لیے دیکھنے پڑھے ہیں کہ ہم نے روایات کے اخذ و نقل میں غفلت سے کام لیا ہے اور تساہل برتا ہے۔ جن لوگوں نے 'سبعۃ أحرف' اور 'قراءتوں' کے مسئلے پر بحث کی ہے، اگر انہوں نے صحیح ترین روایات کو قبول کیا ہوتا اور ان میں وارد اشکالات کو صحیح طریقے سے حل کیا ہوتا تو ہم صحیح نتائج تک پہنچتے، لیکن افسوس کہ ایسا نہ ہوسکا۔ مثلاً 'سبعۃ أحرف' کی تشریح میں بعض لوگوں نے آنکھ بند کرکے سارے اقوال نقل کردیے ہیں، یہاں تک کہ ان کی تعداد تقریباً چالیس تک پہنچ گئی ہے۔ سیوطیؒ نے الاتقان میں ان تمام اقوال کو جمع کردیا ہے۔ اس فکری بے راہ روی نے مشکلات کھڑی کردی ہیں اور اس کی وجہ سے شبہات پیدا ہوئے ہیں۔

سبعۃ اُحرف کی تشریح میں وارد تمام اقوال پر تفصیل سے بحث کرنے کا موقع نہیں، لیکن یہاں ہم ان میں سے چند اقوال پیش کریں گے، تاکہ اس وہم کا اندازہ لگا سکیں جس نے قرأت بالمعنی کے نظریہ سے متعلق اس قضیہ کو الجھا کر رکھ دیا ہے۔

کیا 'سبعۃ اُحرف' سے مراد سات وجوہِ اختلاف ہیں؟

'سبعۃ اُحرف' کی ایک تشریح یہ کی گئی ہے کہ اس سے مراد سات وجوہِ اختلاف ہیں۔ ابن قتیبہ نے ان میں سے درج ذیل گنائے ہیں:

---

۶۶ دیکھیے: البرھان، ۱/۳۳۵۔

البرھان میں ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے آیت وَجَآءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ ..... (ق:۱۹) کو یوں پڑھا: وجاءت سكرة الحق بالموت.[۶۶]

اس طرح مستشرقین نے پوری کوشش کی کہ نص قرآن اور اس کی قراُتوں کے محفوظ ہونے میں شبہ پیدا کردیں۔ اگر قرآن نے دعویٰ کیا ہے کہ پہلے کی آسمانی کتابوں میں تحریف ہوگئی ہے تو خود اس میں ہونے والی تحریفات کم نہیں ہیں۔

'سبعۃ اُحرف' پر تحقیقی بحث

یہ کڑوے کسیلے پھل ہمیں اس لیے دیکھنے پڑھے ہیں کہ ہم نے روایات کے اخذ و نقل میں غفلت سے کام لیا ہے اور تساہل برتا ہے۔ جن لوگوں نے 'سبعة أحرف' اور 'قراءتوں' کے مسئلے پر بحث کی ہے، اگر انہوں نے صحیح ترین روایات کو قبول کیا ہوتا اور ان میں وارد اشکالات کو صحیح طریقے سے حل کیا ہوتا تو ہم صحیح نتائج تک پہنچتے، لیکن افسوس کہ ایسا نہ ہوسکا۔ مثلاً 'سبعة أحرف' کی تشریح میں بعض لوگوں نے آنکھ بند کرکے سارے اقوال نقل کردیے ہیں، یہاں تک کہ ان کی تعداد تقریباً چالیس تک پہنچ گئی ہے۔ سیوطیؒ نے الاتقان میں ان تمام اقوال کو جمع کردیا ہے۔ اس فکری بے راہ روی نے مشکلات کھڑی کردی ہیں اور اس کی وجہ سے شبہات پیدا ہوئے ہیں۔

سبعۃ اُحرف کی تشریح میں وارد تمام اقوال پر تفصیل سے بحث کرنے کا موقع نہیں، لیکن یہاں ہم ان میں سے چند اقوال پیش کریں گے، تاکہ اس وہم کا اندازہ لگا سکیں جس نے قرأت بالمعنی کے نظریہ سے متعلق اس قضیہ کو الجھا کر رکھ دیا ہے۔

کیا 'سبعۃ اُحرف' سے مراد سات وجوہِ اختلاف ہیں؟

'سبعۃ اُحرف' کی ایک تشریح یہ کی گئی ہے کہ اس سے مراد سات وجوہِ اختلاف ہیں۔ ابن قتیبہ نے ان میں سے درج ذیل گنائے ہیں:

---

۶۶ دیکھیے: البرھان، ۱/۳۳۵۔

'النشر فی القرأت العشر' میں لکھا ہے کہ ''جو شخص کہتا ہے کہ بعض صحابہ مثلاً حضرت ابن مسعودؓ وغیرہ قرأت بالمعنی کو جائز قرار دیتے تھے، وہ جھوٹا ہے..... ہاں بسا اوقات وہ قرأت میں توضیح وتبیین کے لیے تفسیر داخل کر دیتے تھے، اس لیے کہ نبی ﷺ سے براہِ راست اخذ و استفادہ کی بنا پر وہ قرآن کو اچھی طرح جانتے تھے، اس لیے ان کے تعلق سے قرآن اور غیر قرآن میں التباس کا اندیشہ نہیں تھا۔ بسا اوقات وہ قرآن کے ساتھ اس کی تفسیر لکھ لیا کرتے تھے[۶۹]۔

بعض صحابہ کے مصاحف میں تفسیری اضافات ہونے کی تائید شہاب خفاجی کی ایک روایت سے ہوتی ہے۔ وہ کہتے ہیں: مصحف ابن عباس میں اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ..... (الاحزاب:۶) کے بعد وھو اب لھم کا اضافہ تھا۔ ایک مرتبہ ایک غلام اس آیت کو مذکورہ اضافہ کے ساتھ پڑھ رہا تھا۔ حضرت عمرؓ وہاں سے گزرے اور غلام کو اضافہ کے ساتھ پڑھتے ہوئے سنا تو فرمایا: ''اسے اپنے صحیفے سے مٹا دو۔'' راوی کہتے ہیں: غلام قرآن اور تفسیر میں فرق نہیں کر سکا تھا[۷۰]۔

بہت سے علماء نے ان مترادفات کو وحی میں شمار کرنے سے انکار کیا ہے اور بعض علما نے انہیں قبول کرنے میں تردّد کا اظہار کیا ہے اور انہیں آحاد میں شمار کیا ہے۔ یہ ان کا تسامح ہے، اس لیے کہ اگر انہیں صحیح فرض کر لیا جائے تو بھی متواتر کے مقابلے میں وہ باطل ٹھہریں گے۔

امام سیوطی نے اس قضیہ کی مزید وضاحت کی ہے انہوں نے قرآن کی کئی قسمیں بیان کی ہیں: متواتر، آحاد، شاذ، موضوع۔ پھر لکھا ہے: ایک چھٹی قسم بھی میری سمجھ میں آئی ہے اور وہ ہے مدرَج، یعنی جس کا اضافہ نص قرآن میں بطور تفسیر کر لیا گیا ہو۔ مثلاً آیت وَلَهٗ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ (النساء:۱۲) کے بعد حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کی قرأت میں من ام کا اضافہ ہے اور آیت لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ..... (البقرۃ:۱۹۸) کے بعد حضرت ابن عباسؓ کی قرأت میں فی موسم الحج کا اضافہ ہے۔ روایت ہے کہ حضرت حسنؒ آیت

---

۶۹ النشر فی القرأت العشر، ابن الجزری، ۱/۳۲۔

۷۰ ملاحظہ کیجیے: نسیم الریاض فی شرح شفاء القاضی عیاض، ۱/۳۰۳۔

وَ اِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا..... (مریم:۷۱) کے آگے الورود الدخول کا اضافہ بطور تفسیر تھا، لیکن بعض راویوں نے غلطی سے اسے قرآن میں شامل کر دیا[۱]۔

ہمیں ان علماء پر حیرت ہے جو ان وجوہِ اختلاف کو 'سبعۃ اُحرف' میں سے شمار کرتے ہیں، حالانکہ ان کا ان سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔ ہمیں مزید حیرت ان حضرات کے رویے سے ہوتی ہے جو ان روایات کا دفاع کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''ہمیں یقین ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے ان وجوہ میں قرأت قرآن کی اجازت تھی، لیکن حضرت عثمانؓ کے جمع قرآن کے بعد ان کا خاتمہ ہوگیا۔ اب کسی کو ان میں قرأت کرنے کا حق نہیں رہا۔ ان کا تذکرہ بس بطورِ تفسیر کیا جاسکتا ہے۔ مصاحف صحابہ میں جو اضافے مذکور ہیں، ان کا یہی حکم ہے[۲]۔''

اگر یہ اضافے جزوِ قرآن نہیں ہیں تو پھر اس یقین کے کیا معنی؟

پھر جن لوگوں نے 'سبعۃ أحرف' کا اطلاق سات وجوہِ اختلاف پر کیا ہے ان میں وجوہ کے سلسلے میں اختلاف ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہلے علماء نے استقراء کے ذریعہ جو وجوہ بیان کیے ہیں، بعد کے لوگوں کو ان پر اطمینان نہیں ہوا اور ان میں کمی محسوس ہوئی، اس لیے انہوں نے متقدمین سے مختلف انداز پر وجوہِ اختلاف شمار کرائے[۳]۔

کیا ان سے مراد عرب کی سات زبانیں ہیں؟

'سبعۃ أحرف' کے سلسلے میں ایک دوسری رائے یہ ہے کہ ان سے مراد عرب کی سات زبانیں ہیں۔ اس رائے کے قائلین کے درمیان اس چیز میں اختلاف ہے کہ وہ سات زبانیں کون کون سی ہیں اور نص قرآن میں ان کے وقوع کی نوعیت کیا ہے؟ ابن جریر طبری فرماتے ہیں:

۱؎ الاتقان، ۱/۷۷

۲؎ ملاحظہ کیجیے: تاریخ القرآن، ڈاکٹر عبدالصبور شاہین، ص ۸۹۔

۳؎ ملاحظہ کیجیے: ہماری کتاب من قضایا القرآن، ص ۲۶۔۳۱۔

''اس سے مراد ایک حرف اور ایک لفظ میں سات زبانیں ہیں۔ یعنی الفاظ مختلف ہوں، لیکن ان کے معانی ایک ہوں۔ مثلاً هلمّ، أقبل، تعال، الیّ، قصدی، نحری، قربی کہ یہ سب الفاظ مختلف لیکن ہم معنی ہیں، جیسا کہ ابوبکرۃ ثقفی سے روایت ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جبرئیلؑ نے کہا: قرآن کو ایک حرف پر پڑھو۔ میکائیلؑ نے کہا: ایک سے زائد حروف پر پڑھنے کی اجازت لے لیجیے۔ جبرئیلؑ نے کہا: اچھا دو حروف پر پڑھ سکتے ہو، یہاں تک کہ انہوں نے چھ یا سات حروف پر پڑھنے کی اجازت دے دی، پھر فرمایا: اتنا کافی ہے۔ ان میں سے کسی حرف پر بھی قرآن پڑھا جاسکتا ہے، بشرط یہ کہ آیت عذاب کے آخر میں رحمت کا اور آیت رحمت کے آخر میں عذاب کا ذکر نہ ہو جائے۔ مثلاً هلمّ اور تعال کہ دونوں الفاظ کے معنی ایک ہی ہیں''[۷۴]۔

اس قول سے بہ ظاہر معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کی قرأت بالمعنی جائز ہے، لیکن اس کے رد میں کہا گیا ہے کہ اس حدیث کے مضمون میں حصر نہیں ہے کہ اس سے اس قول پر استدلال کیا جاسکے۔ بلکہ جیسا کہ ابن عبدالبرؒ نے فرمایا ہے۔ اس میں ان حروف کی (جن پر قرآن نازل ہوا ہے) تمثیل بیان کی گئی ہے کہ ان سے مراد ایسے مضامین ہیں جن کے الفاظ اگرچہ مختلف ہوں، لیکن ان کے معنی و مفہوم میں اختلاف نہیں ہے، یعنی وہ متضاد معانی اور متعارض وجوہ پر دلالت نہیں کرتے کہ مثلاً ایک ہی آیت میں رحمت کا بھی ذکر ہو اور عذاب کا بھی''[۷۵]۔

مذکورہ بالا نصوص کے ذریعہ مستشرقین نے 'قرأت بالمعنیٰ' کے اپنے نظریے کو تقویت دی ہے۔ ان روایات سے جہاں ایک طرف مستشرقین نے خوب فائدہ اٹھایا ہے وہیں بہت سے محققین انہیں مطلق خاطر میں نہیں لاتے، بلکہ انہیں 'خرافات' قرار دیتے ہیں، جنہیں قرآن کے اعجازِ الفاظ اور بلاغت معانی کے احترام میں تاریخ تدوین قرآن سے خارج کر دینا چاہیے۔

جس شخص کو بھی عقل اور ذوقِ سلیم کا تھوڑا سا حصہ ملا ہے، وہ بخوبی جانتا ہے کہ لفظ 'هلمّ' کی دلالت ان الفاظ کے مثل نہیں ہے جنہیں ابن جریرؒ نے اس کے مترادفات کی حیثیت

---

۷۴ دیکھیے: مقدمہ تفسیر طبری، ۱/ ۵۷ ومابعد

۷۵ دیکھیے: البرھان، ۱/ ۲۲۱۔ الاتقان، ۱/ ۱۶۸۔

سے پیش کیا ہے، یعنی: اقبل، تعال، الیّ، قصدی، نحوی، قربی. ان الفاظ کے معانی میں فرق پایا جاتا ہے۔ لفظ 'قربی' سے معلوم ہوتا ہے کہ دو چیزیں یا دو اشخاص ایک دوسرے سے قریب ہیں۔ 'الیّ' میں فریاد کے ساتھ نداء کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ 'تعالی، اور 'نحوی' بھی ہم معنی نہیں ہو سکتے، کیوں کہ ہم بسا اوقات دونوں الفاظ کو ایک ساتھ استعمال کر کے اس سے مختلف مفہوم مراد لیتے ہیں، جو صرف لفظ 'تعال' سے حاصل ہوتا ہے[۷۶]۔

پھر قرآن کا کیا اعجاز باقی رہ جائے گا اگر کوئی انسان ان کی جگہ ایسے الفاظ کا استعمال کر لے جن سے مفہوم صحیح طور پر ادا نہ ہو رہا ہے اور وہ سیاق میں بھی درست نہ ہو، مثلاً آیت: اِنَّ شَجَرَةَ الزَّقُّومِ ○ طَعَامُ الْاَثِيْمِ ○ (الدخان: ۴۳۔۴۴) میں 'اثیم' کی جگہ لفظ 'فاجر' رکھ دے، جیسا کہ ایک روایت میں کہا گیا ہے کہ حضرت ابن مسعودؓ نے ایک بدو کو ایسا کرنے کی اجازت دے دی تھی۔

کیا 'سبعۃ اَحرف' اس کھلواڑ اور استخفاف کی نوعیت کی کوئی چیز ہے جس کا اظہار اس روایت سے ہوتا ہے کہ ایک بدو سورۂ نوح کی پہلی آیت کو یوں پڑھ رہا تھا: اِنّا بعثنا نوحاً الی قومه اس سے کہا گیا کہ صحیح آیت یوں ہے: اِنَّا اَرْسَلْنَا نُوْحاً قَوْمِهٖ تو اس نے جواب دیا: دونوں میں کوئی فرق نہیں، سوائے تمہاری کٹ حجتی کے۔

ایسی روایات کیوں کر قابل قبول ہو سکتی ہیں جب کہ ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی ﷺ نے ایک مرتبہ حضرت براء بن عازبؓ کو ایک دعا سکھائی، اس میں ایک جملہ یہ تھا: ونبیک الذی ارسلت حضرت براءؓ نے اس کے بجائے کہا 'ورسولک الذی ارسلت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ٹوکا اور فرمایا: یہ نہیں بلکہ نبیک کہو[۷۷]۔

دونوں الفاظ درست تھے اور ایک کی جگہ دوسرے کو استعمال کرنے سے معنی میں بھی کوئی تبدیلی نہیں ہو رہی تھی، لیکن آپ نے لفظ 'نبی' کی جگہ 'رسول' استعمال کرنے سے منع فرمایا۔ اس کی وجہ غالباً بس یہ تھی کہ اس سیاق میں لفظ ''نبی'' ہی کا استعمال درست تھا، اسی لیے آپ

---

۷۶ ملاحظہ کیجیے: عن القرآن، صبیح، ص ۱۲۴۔

۷۷ صحیح بخاری، کتاب الدعوات، باب اذا بات طاہراً

نے اس کے بجائے دوسرا لفظ کہنے سے منع کیا[۷۸]۔

صحیح بات یہ ہے کہ 'سبعۃ اُحرف' اس تبدیلی کی نوعیت کی کوئی چیز نہیں ہے اور نہ اسے 'قرأت بالمعنیٰ' کے نظریے کی بنیاد بنایا جاسکتا ہے۔ ذیل میں ہم 'سبعۃ اُحرف' کی وجہ توجیہ بیان کرنے جارہے ہیں اس سے یہ حقیقت واضح ہوجائے گی اور وہ توجیہ عقلی اعتبار سے بھی قابل قبول ہوگی اور آثار و روایات سے بھی اس کے مطابقت ہوجائے گی۔

'سبعۃ اُحرف' صحیح مفہوم

'سبعۃ اُحرف' کے صحیح مفہوم تک پہنچنے کے لیے ضروری ہے کہ ان احادیث کا مطالعہ کیا جائے جن میں اس کا تذکرہ آیا ہے اور ان حالات کو بھی پیش نظر رکھا جائے جن میں یہ بات کہی گئی ہے۔ اس سلسلے میں ایک حدیث ابوکریب کے واسطے سے حضرت ابی بن کعبؓ سے مروی ہے کہ احجار المراء کے پاس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات حضرت جبرئیل علیہ السلام سے ہوئی تو آپ نے فرمایا: ''میری بعثت ایک ناخواندہ قوم کی طرف ہوئی ہے۔ ان میں غلام اور خادم بھی ہیں اور بوڑھے اور معذور لوگ بھی''۔ حضرت جبرئیلؑ نے فرمایا: وہ قرآن کو 'سات حروف' پر پڑھ سکتے ہیں''[۷۹]۔

اس حدیث میں صراحت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ایک ناخواندہ قوم کی طرف ہوئی تھی۔ ان میں سے ایسے لوگ بھی تھے جو قرآن کے تلفظ کو صحیح طریقے سے ادا کرنے سے قاصر تھے، اس لیے آپ نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں درخواست کی کہ اس معاملہ میں ان کے لیے آسانی پیدا کی جائے۔ آپ کی درخواست کو شرفِ قبولیت حاصل ہوا اور ان کے لیے بڑی آسانی کردی گئی۔ یہ واقعہ مدینہ کا ہے، اس لیے احجار المراء مدینہ سے باہر قباء کے پاس ایک مقام کا نام ہے[۸۰]۔

---

۷۸ ملاحظہ کیجیے: مناھل العرفان، زرقانی، ۱/۱۸۲۔

۷۹ حدیث کے الفاظ ابواسامہ کے ہیں، اس کی سند حسن صحیح ہے۔ الطبری ۱/۳۵

۸۰ حدیث کے الفاظ ابواسامہ کے ہیں، اس کی سند حسن صحیح ہے۔ الطبری ۱/۳۵

اور جہاں تک حالات کا تعلق ہے تو یہ بات واضح ہے کہ مدنی معاشرہ ایک ایسا معاشرہ تھا جن میں مختلف رنگ، نسل اور قبیلوں سے تعلق رکھنے والے لوگ بستے تھے اور جزیرۃ العرب کے اطراف سے اور اس کے باہر سے بھی لوگ کثرت سے اسلام قبول کرنے کے ارادے سے آتے رہتے تھے[۸۱]۔

بدیہی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ قرأتِ قرآن کے معاملے میں رخصت دینے اور آسانی پیدا کرنے کا آغاز تھا۔ بعد میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے قرأت قرآن کے سلسلے میں بعض صحابہ کے اختلافات پیش کیے گئے تو آپ نے بھی یہی بات فرمائی، اگرچہ ان روایات سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اختلافات کی نوعیت کیا تھی؟

اگر اس کے ساتھ ہم بعض لغوی حقائق کا بھی اضافہ کرلیں تو یہ بہ خوبی واضح ہوجائے گا کہ یہ لوگ نص قرآن کی صحیح طریقے پر ادائیگی سے کیوں قاصر تھے؟ اہل عرب کی زبانیں ایک ایسی 'ٹکسالی' زبان میں ڈھل گئی تھیں جسے قریش نے مختلف قبائل کی زبانوں سے منتخب کیا تھا اور مختلف قبائل سے تعلق رکھنے والے ان کے خواص (نہ کہ عوام) نے اپنی محفلوں اور بازاروں میں اسے اپنی مافی الضمیر کے اظہار کا ذریعہ بنایا تھا اور اسی میں وہ اشعار کہتے اور خطبے دیتے تھے۔ اسی ٹکسالی زبان سے اسلام ہم آہنگ ہوا اور اسی میں قرآن نازل ہوا۔ اس سے اس زبان کی وحدت مضبوط ہوئی اور اس کی جامعیت میں اضافہ ہوا، لیکن اس لغوی وحدت سے ان مختلف لہجوں کا خاتمہ نہیں ہوا جو ماقبل اسلام میں رائج تھے، بلکہ وہ اسلام کے بعد بھی مختلف قبائل میں باہم گفتگو کے ذریعہ کی حیثیت سے باقی رہے اور جو شخص کسی وجہ سے اس ٹکسالی زبان میں گفتگو نہ کرسکتا تھا وہ اپنے قبیلے میں رائج لہجے کا سہارا لیتا تھا۔

چوں کہ مختلف قبیلوں میں ان کے اپنے لہجے رائج تھے اور دوسری جانب عوام قرآن کی تلاوت کے دوران قرآن کی ٹکسالی زبان کی ادائیگی میں دشواری محسوس کرتے تھے، اس لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں درخواست دی کہ وہ جس طرح قرآن کو بہ سہولت پڑھ سکتے ہوں پڑھیں اور ان کی زبانیں جس لہجے سے مانوس ہیں اس کے علاوہ

---

۸۱ تاریخ القرآن، ڈاکٹر شاہین، ص ۴۲۔

دوسرے لہجے میں بہ تکلف تلاوت کرنے کی زحمت نہ کریں[۸۲]۔

تمام علماء نے اس چیز کو (سبعۃ أحرف کی تشریح میں اپنے نقطہ ہائے نظر کے اختلاف کے باوجود) رخصت کا سبب قرار دیا ہے۔ ابوشامہ کہتے ہیں:

"قرآن کو قریش کی زبان کے علاوہ دوسری زبانوں میں پڑھنے کی اجازت دی گئی۔ یہ اجازت تمام اہل عرب کے لیے تھی، اس لیے کہ یہ مناسب نہیں تھا کہ کسی قبیلہ کو اس کی اجازت دی جائے اور کسی کو نہ دی جائے اور یہ کہ کسی شخص کو اس کی استطاعت سے زیادہ مکلف قرار دیا جائے، مثلاً جس شخص کی زبان میں امامہ یا ہمزہ کی تخفیف یا ادغام کیا جاتا ہو یا میم جمع کو پیش دیا جاتا ہو یا ہائے کنایہ کو ملایا جاتا ہو، اسے اس سے مختلف چیز کا کیوں کر پابند کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح جس شخص کی زبان ایسی ہو، مثلاً لفظ 'اشدق' کہنے میں اس کے منھ سے 'ش' کے بجائے 'ج' نکلتا ہو یا 'مصدر' کہنے میں 'ص' کی بجائے 'ز' نکلتا ہو وہ اس شخص کے درجے میں ہے جس کی زبان میں لکنت اور ہکلاپن ہو۔ اسے اس کی استطاعت سے زیادہ کا مکلف نہیں کیا جاسکتا۔ ہاں اس پر لازم ہوگا کہ وہ قرآن کو صحیح طریقے سے پڑھنے کی کوشش کرتا رہے۔"[۸۳]

یہی بات پہلے ابن قتیبہ بھی کہہ چکے تھے۔ انہوں نے لکھا ہے:

"اللہ تعالیٰ نے یہ آسانی پیدا کردی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ ہر قبیلے کو اس کی اپنی زبان میں، جس سے وہ مانوس ہے، قرآن پڑھائیں، چنانچہ قبیلۂ ہذیل سے تعلق رکھنے والا حتّیٰ حین کو عتّی حین پڑھتا ہے۔ قبیلۂ اسد کا آدمی تعلمون کو 'ت' کے زیر سے پڑھتا ہے۔ تمیمی ہمزہ کے ساتھ بولتا ہے اور قریشی ہمزہ کے ساتھ نہیں بولتا۔ اگر ہر قبیلے والوں کو حکم دیا جاتا کہ وہ اپنی زبان ترک کردیں جسے بولتے ہوئے ان کا بچپن اور جوانی گزری ہے اور بڑھاپا گزر رہا

۸۲۔ ملاحظہ کیجیے: فقہ اللغۃ، ڈاکٹر صبحی صالح، ص ۵۰ اور فی اللھجات العربیۃ، ڈاکٹر ابراہیم انیس، ص ۴۳۔

۸۳۔ المرشد الوجیز، ص ۹۷۔

ہے تو اس میں انہیں سخت دشواری پیش آتی اور انتہائی زحمت ہوتی، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت اور لطف و کرم سے جس طرح دین کے معاملہ میں ان کے لیے آسانی فرمائی اسی طرح زبانوں اور حرکات کے سلسلے میں بھی انہیں رخصت دی۔''[۸۴]

یہاں اس حقیقت کا اظہار ضروری ہے کہ علماء نے اپنے بیانات میں صحیح لغوی اصطلاحات کا استعمال نہیں کیا ہے۔ وہ 'لہجوں' کے لیے 'زبانوں' (لغات) کا لفظ لائے ہیں، اگرچہ بطورِ مجاز یہ استعمال جائز ہے، لیکن اس جگہ یہ غلط فہمی پیدا کرنے والی تعبیر ہے، اس لیے کہ اس سے دو لغوی مفہوم (یعنی زبان اور لہجہ) خلط ملط ہو جاتے ہیں۔ اس جگہ لفظ 'لہجہ' کا استعمال کرنا چاہیے نہ کہ لفظ 'زبان' (لغۃ) کا، اس لیے کہ رخصت مشقت کو دور کرنے کے لیے دی گئی اور اس کا تعلق لہجوں سے ہے نہ کہ زبانوں سے۔ لہجہ نام ہے ان صوتی اوصاف کا جن کا تعلق لفظ کی ادائیگی کے طریقے سے ہے اور اس معاملے میں مختلف قبیلوں میں اختلاف ہوتا ہے۔ مثلاً بعض قبائل زور سے آواز نکالتے ہیں تو بعض آہستہ، بعض کی آوازوں میں کرختگی ہوتی ہے تو بعض میں نرمی، بعض الگ الگ کر کے بولتے ہیں تو بعض ملا کر، بعض ہمزہ کو مخفف کر کے بولتے ہیں تو بعض اسے ظاہر کرتے ہیں اور لفظ کے ڈھانچے اور اعراب میں بھی ان میں اختلاف ہوتا ہے۔ یہ وہ اوصاف ہیں جنہیں ترک کر کے دوسرے اوصاف اختیار کرنا دشوار ہوتا ہے[۸۵]۔ جب کہ 'زبان' (لغۃ) سے مراد الفاظ اور ان کی دلالتوں کا اختلاف ہوتا ہے۔ اس کی رعایت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی، اس لیے کہ قرآن نے اس ٹکسالی زبان کے الفاظ استعمال کیے ہیں جو تمام اہل عرب کی زبانوں سے مل کر بنی تھی[۸۶]۔

اس تفصیل سے واضح ہوا کہ 'سبعۃ أحرف' کی قابل قبول تشریح یہ ہے کہ اس سے مراد الفاظ کی ادائیگی کے وہ طریقے ہیں جن سے عربوں کے لہجوں میں تبدیلی آجاتی ہے اور

---

۸۴ تاویل مشکل القرآن، ص ۳۹۔۴۰

۸۵ فی اللھجات العربیۃ، ص ۱۶۔۱۹۔

۸۶ علوم القرآن، الصالح، ص ۱۱۳۔۱۱۵

'قرآن کے ساتھ حروف پر نازل ہونے' کا مطلب یہ ہے کہ قرآن پڑھنے والے کو رخصت دی گئی ہے کہ جس طرح اسے پڑھنے میں آسانی ہو اور وہ بغیر مشقت کے الفاظ ادا کر سکے، ویسے ہی پڑھے۔

لفظ 'سبعۃ' (سات) اس مطلق اجازت میں رکاوٹ نہیں ہے، اس لیے کہ یہ عربی زبان کا 'عدد تام' ہے اور اس سے اہل عرب اچھی طرح واقف تھے[۸۷]۔

سیوطیؒ نے قاضی عیاضؒ کی جانب یہ قول منسوب کیا ہے کہ لفظ 'سبعۃ' (سات) سے مراد حقیقی عدد نہیں ہے، بلکہ اس سے مراد اکائی میں کثرت ہے جس طرح دہائی میں کثرت کے لیے 'سبعین' (ستر) اور سیکڑہ میں کثرت کے لیے 'سبع مائۃ' (سات سو) استعمال کیا جاتا ہے[۸۸]۔

لفظ 'سبعۃ' سے مراد مطلق رخصت ہے۔ اس کا اشارہ حضرت ابن عباسؓ کی اس روایت سے ملتا ہے کہ ''نبی صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو ایک ہی زبان (یعنی لہجہ) میں قرآن پڑھاتے تھے۔ اس سے انہیں زحمت ہوتی تھی، اس پر جبرئیلؑ آئے اور انہوں نے فرمایا: اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہر قوم کو اس کی زبان میں قرآن پڑھایئے''[۸۹]۔

اختلافِ لہجات کے معاملہ میں زیادہ توسّع مناسب نہیں

بعض علماء نے اس سے بھی زیادہ توسّع اختیار کیا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ 'سبعۃ أحرف' کا اطلاق صرف عربی لہجات پر نہیں ہوگا، بلکہ اس میں دنیا کے تمام خطوں میں رہنے بسنے والے آج تک کے مسلمانوں کے لہجے شامل ہیں۔ مسلمان کا کوئی بھی لہجہ ہو، کسی ماحول میں رہتا ہو، وہ الفاظ قرآن کو جس طرح بھی ادا کر سکتا ہو کرے، نہ اس پر نکیر کی جائے گی اور نہ اس کا مذاق اڑایا جائے گا[۹۰]۔

میرا خیال ہے کہ اس رخصت کو صرف عربی زبان کے دائرے میں اور اسلام کی اس

---

۸۷ ملاحظہ کیجیے: اعجاز القرآن، رافعی، ص ۶۸۔ ۸۸ الاتقان، ۱/۱۳۱۔

۸۹ المرشد الوجیز، ص ۹۶۔۹۷۔ ۹۰ اللہجات العربیہ، ص ۵۷۔

روح کے تابع رکھنا چاہیے کہ وہ معذوروں کے لیے آسانی پیدا کرنا چاہتا ہے۔

اس توسّع کا مطلب یہ نہیں ہے کہ قرآن پڑھنے والا الفاظِ قرآن کو جس طرح چاہے ادا کرے، کیوں کہ نبی ﷺ کی جانب سے اس سلسلے میں کوئی ہدایت نہیں دی گئی ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ آپ نے ان لہجات کی نگرانی فرمائی ہے، ان میں سے فصیح لہجے میں پڑھنے کی اجازت دی ہے اور جن لہجوں کی وجہ سے نص قرآنی معیارِ فصاحت سے گر جاتا ہے ان میں پڑھنے سے منع کیا ہے، مثلاً الکشکشة القیسیة جس میں کافِ مؤنث (کِ) کو 'ش' پڑھا جاتا ہے، جیسے آیت قَدْ جَعَلَ رَبُّکِ تَحْتَکِ سَرِیًّا (مریم:۲۴) کے بجائے قَدْ جَعَلَ رَبّش تحتش سریًا اور العنعنة التمیمیة جس میں ہمزہ 'ان' کو 'ع' پڑھا جاتا ہے، جیسے آیت عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَ بِالْفَتْحِ (المائدہ:۵۲) کے بجائے عسی اللّٰہ عن یاتی بالفتح۔[۹۱]

گویا قرآن کریم جس ٹکسالی زبان میں نازل ہوا ہے اور جن لہجات میں خود رسول ﷺ نے پڑھایا ہے یا قراء صحابہ کو پڑھانے کی اجازت دی ہے، وہ اس معاملہ میں برابر ہیں کہ ان میں سے کسی میں بھی قرآن کی تلاوت کی جاسکتی ہے۔ رہے ان کے علاوہ دوسرے لہجے تو ان میں پڑھنے کی رخصت عذر کی بنا پر ہے اور یہ رخصت عارضی ہے اور صرف اس وقت تک ہے جب تک کہ پڑھنے والا سیکھ کر اور مشق کے ذریعے معیاری ادائیگی پر قادر نہ ہو جائے۔[۹۲]

شاید یہی وہ معیار ہے جس کی بنا پر حضرت ابن مسعودؓ نے اس شخص کی قرأت کو غلط قرار دیا تھا جس نے آیت اِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّوْمِ ۝ طَعَامُ الْاَثِيْمِ ۝ (الدخان: ۴۳۔۴۴) میں لفظ 'اَثیم' کو ('اُ' کو 'ی' سے اور 'ث' کو 'ت' سے بدل کر) 'یتیم' (ی کے زیر سے) پڑھا تھا[۹۳]۔ اس طرح آیت کے معنی بدل گئے تھے۔ حضرت ابن مسعودؓ نے اسے سمجھانے کے لیے بتایا کہ 'اثیم' کے معنی 'فاجر' کے ہیں۔ اس کا 'یتیم' سے کیا تعلق؟ حضرت ابن مسعودؓ کی جانب

---

۹۱ المرشد، ص ۱۰۱، ۱۳۱۔

۹۲ علوم القرآن، ڈاکٹر صبحی صالح، ص ۱۰۸۔

۹۳ بعض عرب قبائل ہمزہ کو 'ی' سے بدل دیتے تھے، مثلاً 'تاثم' کو 'تیثم' کہتے تھے۔ اسی طرح 'فعیل' کے وزن پر آنے والے الفاظ کے ابتدائی حرف کو زیر دیتے تھے۔ بعض قبائل 'ث' کو 'ت' سے بدل دیتے تھے، مثلاً 'خبیث' کو 'خبیت' کہتے تھے۔ ملاحظہ کیجیے: لسان العرب مادہ اثم، خبث، جلد اول، ص ۲۲، ۷۸۱، اعداد یوسف خیاط۔

منسوب یہ روایت اگر صحیح ہو تو اس کی یہ توجیہ کی جا سکتی ہے، نہ کہ یہ کہ انہوں نے لفظ 'اثیم' کی جگہ 'فاجر' پڑھ لینے کی اجازت دے دی تھی۔ جو شخص یہ بات کہتا ہے وہ حضرت ابن مسعودؓ پر جھوٹ باندھتا ہے اور 'سبعة أحرف' کے معاملے میں رخصت کو سمجھنے سے قاصر ہے۔

ہم ان محققین کی تائید کرتے ہیں جنہوں نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ یہ "رخصت صرف قرآن کو زبانی پڑھنے کی حد تک تھی، کتابتِ وحی کے معاملے میں کوئی رخصت نہ تھی۔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے نص قرآنی کو اسی ٹکسالی زبان میں لکھوایا تھا جس میں وہ اترا تھا، اس لیے کہ تمام لہجات کو کسی ایک تحریر میں جمع کرنا ممکن نہ تھا[۹۴]۔ دوسرے یہ کہ کتابت وحی کا کام مکہ ہی میں شروع ہو گیا تھا، جب کہ رخصت ہجرتِ مدینہ کے بعد دی گئی تھی۔

قرآن اور قرأتِ قرآن دو الگ الگ چیزیں ہیں

اس مسئلے کی وضاحت کے لیے یہاں یہ صراحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ قرآن اور قرأتیں دو الگ الگ حقیقتیں ہیں، جیسا کہ علمائے متقدمین نے لکھا ہے۔ قرآن وہ وحی ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی ہے اور قرأتوں سے مراد الفاظِ وحی کی ادائیگی کی کیفیت میں اختلاف ہے[۹۵]۔

اگر نص قرآنی کے سلسلے میں اختلاف کیفیت ادا تک منحصر نہ ہو بلکہ حذف و اضافہ یا اختلافِ حروف تک متجاوز ہو جائے، مثلاً سورۂ توبہ کی آیت نمبر ۱۰۰ تَجْرِیْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ دوسرے مصحف میں تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ..... (من کے اضافہ کے ساتھ) ہے اور سورۂ حجرات کی آیت نمبر ۶ اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْا..... میں دوسرے مصحف میں تَبَيَّنُوْا کے بجائے تَثَبَّتُوْا ہے اور یہ دونوں تواتر سے ثابت ہوں تو ان کا شمار قرأتوں میں نہیں ہوگا، بلکہ دونوں نصوص کو قرآن قرار دیا جائے گا اور کہا جائے گا کہ یہ آیتیں دونوں طرح سے اتری ہیں اور نبی ﷺ نے دونوں طرح سے ان کی کتابت کروائی ہے[۹۶]۔

---

۹۴ تاریخ القرآن، ڈاکٹر شاہین، ص ۵۴۔۵۵۔

۹۵ ملاحظہ کیجیے: البرہان، ۱/ ۲۱۸۔

۹۶ المرشد الوجیز، ص ۱۳۸۔

اس بنا پر علماء نے 'سبعة أحرف' کی تشریح میں جو وجوہِ اختلاف بیان کیے ہیں، ان کے سلسلے میں تین باتیں کہی جاسکتی ہیں: یا تو ان کا شمار لہجات میں ہوگا، مثلاً لفظ کی ساخت میں بعض حرکتوں یا اعراب کا اختلاف، یا دونوں نصوص تواتر سے ثابت ہوں گی۔ اس صورت میں دونوں کا شمار وحی میں ہوگا یا دوسری نص تواتر سے ثابت نہیں ہوگی، تو اس کا شمار قرآن میں ہوگا نہ قرأت میں۔

ان حقائق کی روشنی میں 'سبعة أحرف' کی رخصت الفاظِ قرآن کی ادائیگی کے طریقوں تک محدود ہے اور یہ ادائیگی مطلق نہیں ہے، بلکہ لازم ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ویسا ہی پڑھایا ہو یا اس طرح پڑھنے کی اجازت دی ہو اور اس سے وحی کا مفہوم نہ بدل جاتا ہو۔

اس رخصت کا تعلق اس مطلق آزادی سے نہیں ہے کہ قرآن کے کسی لفظ کو بدل کر اس کا مترادف لفظ استعمال کرلیا جائے یا نص میں زیادتی یا کمی کردی جائے یا اس کے نظم و ترتیب کو بدل دیا جائے، جیسا کہ مستشرقین نے اپنے نظریہ 'قرأت بالمعنیٰ' کے تحت خیال ظاہر کیا ہے۔ ان روایات کو قرأتوں کی جانب منسوب کرنا وہم ہے۔ اسے مستشرقین نے اپنے مذموم مقاصد کے لیے رواج دیا ہے۔ ان کا قرأتوں سے کوئی تعلق نہیں، کیوں کہ وہ نہ تو الفاظِ قرآن کی ادائیگی میں اختلاف کو ظاہر کرتی ہیں اور نہ ان کا ثبوت تواتر سے ہے کہ انہیں بھی قرآن قرار دیا جائے۔

البتہ یہ روایات اگر صحیح ہوں تو انہیں تفسیر قرار دیا جاسکتا ہے، جنہیں ان مصاحف کے مالک صحابہؓ نے نص قرآن کے حاشیہ پر کسی مجمل کی وضاحت، کسی محذوف کے بیان یا کسی لفظ کی تشریح کے لیے لکھ لیا تھا، اس لیے کہ وہ حضرات اسبابِ نزول اور مقاصد شریعت کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔

اس کام کا مقصد خواہ کتنا ہی پاکیزہ رہا ہو، لیکن یہ حقیقت ہے کہ نص قرآنی پر اس کے سلبی اثرات مرتب ہوئے ہیں، اس لیے کہ ان مصاحف کے وارثین یا ان سے اخذ و استفادہ کرنے والوں نے گمان کرلیا کہ ان میں جو کچھ درج ہے سب وحی قرآنی کے الفاظ ہیں۔ تاریخ جمع و تدوین قرآن کے ساتھ کتنی زیادتی ہوئی ہے کہ متقدمین کی کتابوں میں ان

اضافات کو 'سبعة أحرف' قرار دے کر انہیں وحی کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے اور متاخرین نے بغیر بحث و تحقیق کے انہیں جوں کا توں نقل کر لیا ہے[97]۔

مصحف عثمانی میں مختلف قرأتوں کی حقیقت

اب ان وجوہِ قرأت کی طرف اشارہ کرنا رہ گیا ہے جو مصحف عثمانی کے نقطوں اور اعراب سے خالی ہونے کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں، جیسا کہ مستشرقین دعویٰ کرتے ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کی بھی حقیقت واضح کر دی جائے۔ اس سلسلہ میں ابتدا ہی میں یہ جان لینا ضروری ہے کہ بغیر نقطوں کے قرآن کی کتابت کروانے کا مقصد یہ تھا کہ اگر کسی لفظ کی متعدد قرأتیں ہوں تو ان کے لیے ایک ہی رسم الخط اختیار کیا جا سکے۔ بعض مواقع پر ایسا ممکن نہ ہو سکا اور مختلف قرأتیں ایک رسم الخط کے تحت نہ آ سکیں تو بعض مصاحف میں ایک قرأت لکھ گئی اور بعض دیگر مصاحف میں دوسری قرأت[98]۔

ایسا کرنے کا مقصد یہ تھا کہ قرآن کو مختلف لہجات میں پڑھا جا سکے اور لوگ اس رخصت سے فائدہ اٹھا سکیں، جو اللہ تعالیٰ نے انہیں عطا فرمائی ہے۔ مثال کے طور پر سورۂ قصص کی آیت نمبر ۲۹ یہ ہے: اَوْ جَذْوَةٍ مِّنَ النَّارِ. لفظ 'جَذْوة' کو اہل حجاز 'ج' کے زبر سے پڑھتے تھے، چنانچہ عاصم نے اسی طرح قرأت کی ہے۔ بنو تمیم 'ج' کے زیر سے پڑھتے تھے، چنانچہ بقیہ ساتوں قراء نے اسی طرح قرأت کی ہے[99]۔

حضرت عثمانؓ نے لوگوں کو آزاد نہیں چھوڑ دیا کہ وہ جس طرح چاہیں نص قرآنی کو پڑھیں، بلکہ ہر علاقے میں مصحف کے ساتھ ایک قاری (قرآن پڑھانے والے) کو بھیجا، چنانچہ مصحف مدنی کو پڑھانے کے لیے حضرت زید بن ثابتؓ، مصحف مکی کو پڑھانے کے لیے حضرت عبداللہ بن سائبؓ، مصحف شامی کو پڑھانے کے لیے حضرت مغیرہ بن شہابؓ، مصحف کوفی کو پڑھانے کے لیے حضرت ابوعبدالرحمٰن سلمیؒ اور مصحف بصری کو پڑھانے کے لیے

---

۹۷ ملاحظہ کیجیے، ہماری کتاب من قضایا القرآن، ص ۷۶۔ ۹۸ کتاب المصاحف، ص ۴۰۔۴۹۔
۹۹ البحر المحیط، ۶/۳۲۲۔

حضرت عامر بن عبدالقیسؒ کو بھیجا[100]۔

ایسا کرنا دو وجوہ سے ضروری تھا:

پہلی وجہ یہ کہ اس بات کا اندیشہ تھا کہ مخصوص رسم الخط کی بنا پر بعض الفاظ کو نامطلوب صورت میں ادا کیا جائے، مثلاً وَالْاُمِّیّٖنَ (آل عمران:۲۰) کو والامین (ایک 'ی' سے) اَلنَّبِیّٖنَ (آل عمران:۲۱) کو النبین (ایک 'ی' سے) اور لَاَذْبَحَنَّهٗ (النمل:۲۱) کو لااذبحنہ (الف کے اضافہ کے ساتھ) لکھا جاتا تھا۔ اسی طرح آیت وَالسَّمَآءَ بَنَیْنٰهَا بِاَیْدٍ..... (الذاریات:۴۷) میں لفظ بایدٍ کو باییدٍ (دو 'ی' کے ساتھ) لکھا جاتا تھا۔

ایسے الفاظ کی تعداد تقریباً دوسو چالیس ہے[101]۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ اس طرح ہر علاقہ کے باشندوں کو اس بات پر آمادہ کرنا تھا کہ جو مصحف ان کے پاس بھیجا گیا ہے اس کے رسم الخط سے جو قرأتیں مختلف ہیں، انہیں ترک کردیں، چنانچہ لوگوں نے ایسا ہی کیا۔ عربی لہجات میں بعض آوازوں کو بعض پر ترجیح دی جاتی تھی، مثلاً بدو دھیمی آوازوں کے مقابلے میں کرخت اور تیز آوازوں کو ترجیح دیتے تھے، چنانچہ شہری آیت مِنْۢ بَقْلِهَا وَ قِثَّآئِهَا وَ فُوْمِهَا (البقرہ:۶۱) کو 'ف' سے پڑھتا تھا تو بدو وَثُوْمِهَا (ث سے) پڑھتا تھا۔ اول الذکر اہل حجاز کی لغت ہے اور مؤخر الذکر بنو تمیم کی[102]۔

اس طرح لوگوں نے بہت سی صحیح قرأتیں چھوڑ دیں جو مصحف عثمانی کے رسم الخط سے مطابقت نہ رکھتی تھی، تاکہ الفاظ میں اختلاف نہ ہو اور مختلف لہجوں میں قربت پیدا ہوجائے[103]۔

ایسی قرأتیں اگرچہ صحیح تھیں، لیکن مصحف عثمانی کے رسم الخط سے مختلف ہونے کی بنا پر قراء کی اصطلاح میں شاذ قرأتیں کہلائیں۔ اس طرح مصحف عثمانی کو قرأتوں کے سلسلے میں حَکَم کی حیثیت حاصل ہوگئی، نہ کہ اس کی وجہ سے قرأتوں کا اختلاف رونما ہوا جیسا کہ

۱۰۰؎ ملاحظہ کیجیے: مناھل العرفان، ۱/۳۹۶ ۱۰۱؎ کتاب المصاحف، ص ۱۰۵۔۱۱۶۔

۱۰۲؎ تفسیر القرطبی، ۱/۳۳۱، اللھجات العربیۃ، ص ۱۱۲۔

۱۰۳؎ مقدمہ حجۃ قرأت ابی زرعہ، ص ۱۰، الابانۃ، ص ۱۰، المرشد ۵۳۔۵۴

مستشرقین دعویٰ کرتے ہیں۔

ان متداول مصاحف کا استعمال تقریباً چالیس سال تک (یعنی حضرت عثمانؓ کی خلافت سے عبدالملک بن مروان کے عہد تک) ہوتا رہا ہے۔ اس عرصہ میں محض مصحف پر اعتماد کرنے اور معتبر قراء کی طرف رجوع نہ کرنے کی وجہ سے لوگوں کی زبانوں پر بہت سی غلط قراٴتیں رواج پا گئیں اور اہل بدعات وخرافات روافض وغیرہ نے بھی قرآن کے ساتھ کھلواڑ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ غلط قراٴتوں کی چند مثالیں درج ذیل ہیں:

وَمَا كُنْتُ مُتَّخِذَ الْمُضِلَّيْنَ عَضُدًا ۝ (الکہف:۵۱) کے بجائے الْمُضِلِّيْنَ (تثنیہ)

فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ...... (یٰس:۱۴) کے بجائے فَعَزَرْنَا.

جَعَلَ السِّقَايَةَ فِيْ رَحْلِ اَخِيْهِ...... (یوسف:۷۰) کے بجائے هِيَ رِجْلِ اَخِيْه.

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ...... (البقرۃ:۲) کے بجائے لَا زَيْتَ فيه.

فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ (یونس:۹۲) کے بجائے نُنَحِّيكَ.

بَقِيَّتُ اللّٰهِ خَيْرٌ لَّكُمْ...... (ھود:۸۶) کے بجائے تَقِيَّةُ اللّٰه.

غلط قراٴتیں اگرچہ بعض لوگوں کی زبانوں پر جاری رہیں، لیکن انہیں قرآن نہیں تسلیم کیا گیا، اس لیے کہ ان کا مہمل ہونا واضح تھا اور ان کی صحت کے سلسلے میں کوئی معتبر روایت نہیں تھی۔

پھر مستشرقین کے لیے کیوں کر مناسب ہے کہ وہ ان مہمل اقوال کو قرآن کی بعض قراٴتیں شمار کریں؟ اور قراء کی ان کوششوں اور ان کے طریقۂ کار کو نظر انداز کر جائیں جو انہوں نے قرآن کی قراٴتوں اور ان کی تاریخ کو منضبط کرنے اور صحیح اور غلط کو الگ الگ کرنے میں صرف کی ہیں۔ ماہرین قراٴت کا طریقۂ کار انتہائی دقیق تھا۔ انہوں نے کسی قراٴت کو قبول کرنے کے لیے تین شرطیں رکھی تھیں: (۱) وہ مصحف عثمانی کے رسم الخط کے موافق ہو۔ (۲) صحیح سند سے ثابت ہو اور (۳) عربی زبان اور قواعد کے بھی خلاف نہ ہو۔ ان شرائط کے ساتھ عظیم قراء کے ذریعہ علم قراٴت پروان چڑھا اور اس کی بنیادیں استوار ہوئیں۔

کیا اس تفصیل کے بعد بھی کسی انصاف پسند کے دل میں جمع وتدوین قرآن اور قراءتوں کے سلسلے میں کوئی شبہ باقی رہ جاتا ہے؟

(عربی مضمون حولية كلية الشريعة والدراسات الاسلامية، جامعة قطر العدد الثالث ۱۴۰۴ھ/۱۹۸۴ء میں شائع ہوا تھا۔)

ہماری چند مطبوعات

ڈی-۳۵، بلاک-۵، فیڈرل 'بی' ایریا، کراچی

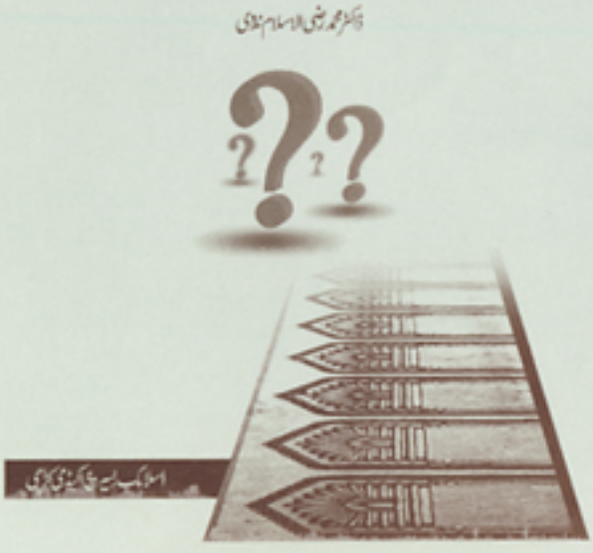

فون: ۳۶۸۰۹۲۰۱-۳۶۳۴۹۸۴۰ (۹۲-۲۱)

برقی پتا: irak.pk@gmail.com، ویب گاہ: www.irak.pk